Registered No. L. 5340

شوال - ۱۳۶۷ھ

جلد ۳۱

عدد ۴

ماہنامہ

ترجمان القرآن

علوم قرآنی و حقائق فرقانی کا ذخیرہ

مرتبہ

سید ابو الاعلیٰ مودودی

دفتر رسالہ "ترجمان القرآن"

۵- اے ذیلدار پارک اچھرہ- لاہور

قیمت سالانہ پانچ روپے

قیمت فی پرچہ ۸ آنے

فہرست مضامین

جلد ۳۱	شوال ۱۳۶۷ھ مطابق اگست ۱۹۴۸ء	عدد ۴

ابوالاعلیٰ مودودی پرنٹر و پبلشر نے کپور آرٹ پریس ایبٹ روڈ لاہور میں چھپوا کر

دفتر ترجمان القرآن اچھرہ، لاہور سے شائع کیا

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

اشارات

مسلمان اس وقت بحیثیت ایک قوم کے جن بڑے بڑے مسائل سے دوچار ہیں ان کا ابھی تک پوری طرح جائزہ نہیں لیا گیا ہے۔ ہمارے سوچنے سمجھنے والے طبقے ان مسائل کا کچھ نہ کچھ ادراک ضرور رکھتے ہیں اور ان پر غور و فکر کرتے بھی رہتے ہیں، لیکن عام طور پر جو بحثیں پڑھنے اور سننے میں آتی ہیں ان سے یہی اندازہ ہوتا ہے کہ نہ تو ان مسائل کا پورا احاطہ کیا گیا ہے اور نہ ان کا تجزیہ کر کے دیکھا گیا ہے کہ ان میں سے ہر ایک مسئلہ کیا نوعیت رکھتا ہے، کیا اس کے اسباب ہیں، کیا اس کی اہمیت ہے، [illegible] نکلتا [illegible] وہ عمل [illegible] تا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ قوم بحیثیت مجموعی اب تک اپنے اصل مسائل سے غافل [illegible] پھر ہمارے [illegible] بڑی تعدا[illegible] ے لوگوں کی بھی ہے جن کی خواہش اور کوشش یہی ہے کہ قوم کو ان [illegible] مسائل سے [illegible] ل کیا اور رکھا جا[illegible] ے۔ وہ اس کی توجہ ان سے ہٹا کر ہنگامی معاملات کی طرف پھیرتے ہیں۔ وہ اسے اب تک وہی نغمے [illegible] ئے جا رہے ہیں جو آزادی سے پہلے الاپ رہے تھے۔ وہ اسے تھپک [illegible] [illegible] نے دے [illegible] کوشش کر رہے ہیں کہ [illegible] ائل یا تو موجود ہی نہیں ہیں یا ہیں بھی تو ان کے لئے کچھ زیادہ [illegible] اب کرنے کی [illegible] نہیں۔ یہ باتیں خواہ نادانی کے ساتھ کی جا رہی ہوں یا ہوشیاری کے ساتھ، اور اپنے کسی [illegible] اغراض کے لئے یہ کتنی ہی مفید ہوں، بہرحال قوم کی خیر خواہی کا ان میں شائبہ تک [illegible] ے مزاج ہے۔ قوم کی [illegible] ائی اسی میں ہے کہ اس کے سامنے واضح طور پر وہ سارے مسائل رکھ دیئے جا[illegible] اور کچھ [illegible] سے اس کو عہدہ بر[illegible] ہونا ہے، پھر اسے یہ سوچنے کی دعوت دی جائے کہ آیا وہ اپنی موجو[illegible] [illegible] مسلمان

میں ان مسائل سے عہدہ برآ ہونے کے قابل ہے یا نہیں۔ اگر ہے تو الحمد للہ، اور نہیں ہے تو سے لامحالہ
اپنے اندر تبدیلی کرنی ہوگی اور غور کرنا پڑیگا کہ وہ تبدیلی کس نوعیت کی ہو۔

ہمارے لئے اس وقت سب سے زیادہ نازک اور سب سے بڑھ کر دلخراش مسئلہ ان مسلمانوں کا ہے
جو تقسیم ملک کے بعد ہندوستان میں رہ گئے ہیں۔ تقسیم کے وقت ان کی تعداد پانچ کروڑ کے لگ بھگ تھی،
یعنی ہماری قوم کا پورا نصف حصہ۔ تقسیم کے بعد ان میں سے کئی لاکھ فنا کے گھاٹ اتار دیے گئے۔ ایک
تعداد جبراً غیر مسلم بنالی گئی، ساٹھ ستر لاکھ پاکستان میں دھکیل دیے گئے اور دس پندرہ لاکھ کو جدید آبادیوں
پناہ لینی پڑی۔ اب اندازہ کیا جاتا ہے کہ چار کروڑ مسلمان ہندوستان میں باقی ہیں۔ یہ باقی ماندہ مسلمان
آج انڈین یونین میں وہی حیثیت رکھتے ہیں جو روس کے تحت مفتوح جرمنوں اور امریکہ کے ماتحت
شکست خوردہ جاپانیوں کی حیثیت ہے۔ دس سال کی تلخ و تیز قومی جنگ کے بعد اب وہ بالکل بے
بسی کے ساتھ اپنے سابق حریفوں کے قبضے میں ہیں۔ انہیں "پاکستان زندہ باد" کی وہ قیمت دینی
رہی ہے جو ان کے شہری حقوق ہی کو نہیں، انسانی حقوق تک کو کھا گئی ہے۔ وہ سب "غدار" اور سب
ہیں۔ ہر ایک کی وفاداری مشتبہ ہے۔ ہر ایک کے لئے خانہ تلاشی اور گرفتاری مقدر ہے الا یہ
باری آنے میں ابھی کچھ دیر ہو۔ پوری قوم اصل میں یرغمال بن چکی ہے۔ اس کے لئے عزت
گی کا دروازہ بند ہے اور صرف تین راستے کھلے ہوئے ہیں: یا تو برضا و رغبت مرتد ہو جائے،
سے بدتر حالت میں رہے، یا پھر خاموشی کے ساتھ ان سب تدبیروں کو برداشت کرتی چلی جائے
امتیازی ہستی کو مٹانے اور اسے ہندو قومیت میں جذب کرنے کے لئے عمل میں لائی جارہی ہیں
اگر یوں ہی جاری رہی تو مستقبل قریب میں مسلمان ہندوستان سے اسی طرح غائب ہو جائینگے
اندلس اور صقلیہ سے غائب ہو چکے ہیں، لا قدر اللہ۔

کروڑ مسلمانوں کی یہ عظیم الشان قوم اس وقت بالکل بے سہارا ہے۔

جس سیاست پر اب تک اس کا مدارِ کار تھا اس کی بساط انقلاب کے ایک ہی پلٹے نے الٹ دی۔ جس قومی تنظیم پر اس کا سارا اعتماد تھا وہ طوفان کا ایک تھپیڑا بھی نہ سہ سکی۔ جن لیڈروں کے ہاتھ میں وہ اپنے معاملات سونپ کر مطمئن ہو بیٹھی تھی وہ اس کے لئے بالکل بے کار ثابت ہوتے۔ ان کے کچھ اکابر تو خاموشی کے ساتھ اٹھ کر پاکستان چلے آئے، اور باقی اکابر و اصاغر سب دشمنوں کے آگے توبہ و استغفار کرنے میں مشغول ہو گئے۔ سیرت و اخلاق کے بغیر جو لوگ محض نعروں کے بل پر لیڈر بنے تھے وہ زمانے کا رُخ بدل جانے کے بعد ایک دن بھی اپنے قبلے کی سمت استوار نہ رکھ سکے۔ انقلاب کی پہلی ہی رات وہ اپنے ان سارے نظریات اور اصولوں کو طلاق مغلظ دے بیٹھے جن پر دس سال سے اپنی قوم کو لڑا رہے تھے۔ دو قومی نظریہ یک لخت ان کے نزدیک باطل ہو گیا۔ یک قومی نظریے کی صداقت اچانک ان پر منکشف ہو گئی۔ ترنگے جھنڈے کی عقیدت یکایک ان کے دل میں گھر کر گئی چند روز کے اندر ان مجاہدینِ ملت کو وطن پرستی میں ایسا شرحِ صدر نصیب ہوا کہ ان کے حلقے سے مخلوط ہندو مسلم شادیوں تک کی تجویزیں آنے لگیں تاکہ مسلم و ہندو کے اندر سے یہ کمبخت "من دیگرم تو دیگری" کا احساس تو کسی طرح دور ہو! اس پورے گروہ میں سے ایک کوہ کن بھی نہ نکلا جو بازی کھونے کے بعد سر دے دے۔ ساری جماعت بازی گروں سے پٹی پڑی تھی جنھوں نے عجیب عجیب قلابازیاں کھا کر دنیا کو اپنی بود اور کھوکھلے اخلاق کا تماشا دکھایا اور اُس قوم کی رہی سہی عزت بھی خاک میں ملا دی جس کے وہ نمائندے بنے ہوئے تھے۔

ان سے مایوس ہو کر اس ڈوبتی ہوئی قوم نے ان تنکوں کا سہارا لینا چاہا جو پہلے سے کانگریسی سطح پر تیر رہے تھے، مگر اب وہ بھی اس کے لئے بے کار ثابت ہو رہے ہیں۔ ان میں سے ایک گروہ بھی وہی رائے رکھتا ہے کہ مسلمان اپنے امتیازی وجود کو خود بھول جائیں اور ہندی قومیت میں آپ کو گم کر دیں۔ ظاہر ہے کہ یہ تحفظِ ذات کا نہیں بلکہ "آسان لمبری" کا نسخہ ہے جو مسلمان کو نہ پہلے راس آیا تھا اور نہ اب راس آسکتا ہے۔ دوسرا گروہ کچھ مسلمان کے "مستقل وجود" اس کے "حقوق" کا بھی تصور رکھتا ہے، مگر یہ نام زبان پر آتے ہی پرانے سے پرانا کانگریسی

بھی ہندو قوم پرستوں کی نگاہ میں بس ایک نقاب پوش لیگی بن کر رہ جاتا ہے۔

ہندوستان کے ان مسلمانوں کا مسئلہ اس وقت درحقیقت ہمارا سب سے بڑا قومی مسئلہ ہے۔ تقسیم نے ہمیں کاٹ ضرور دیا ہے، مگر وہ ہیں ہماری ہی قوم کا ایک حصّہ، اور معمولی نہیں پورا نصف حصّہ۔ ان کو ہم یوں ہی مٹنے کے لئے نہیں چھوڑ سکتے۔ ان کا ہم پر سب سے بڑا حق ہے، اس لئے کہ جس پاکستان سے ہم متمتع ہو رہے ہیں اس کی اصل قیمت انہی نے ادا کی ہے۔ وہ اس لئے بھی نظر انداز کرنے کے قابل نہیں ہیں کہ ہمارا بہترین مردم خیز حصّہ وہی ہیں۔ انہیں اس بنا پر بھی نظر انداز نہیں کیا جا سکتا کہ ہماری ہزار سالہ تہذیب کے تمام چیدہ ثمرات، اور ہمارے تمام بڑے بڑے معاہد اور اداروں کے امانت دار وہی ہیں۔ اور سب سے بڑھ کر یہ کہ آخر ہم ٹھنڈے دل سے یہ بات کیسے گوارا کر سکتے ہیں کہ ہمارے اسلاف نے پچھلے ایک ہزار سال میں جو محنتیں، در جو جانفشانیاں اسلام کے پیغام کو اکناف ہند میں پھیلانے کے لئے کی ہیں ان سب پر پانی پھر جائے اور توحید کی دعوت سمٹ کر برعظیم ہند کے صرف دو چھوٹے چھوٹے خطوں میں محدود ہو جائے۔ لہٰذا کوئی شخص بے پروائی کے ساتھ یہ نہیں کہہ سکتا کہ ہندوستان کے مسلمانوں کا مسئلہ اُن کا اپنا مسئلہ ہے۔ نہیں یہ پاکستان کا بھی ویسا ہی مسئلہ ہے جیسا ہندوستان کا ہے، اور فی الواقع یہ اس پوری ملت اسلامیہ کا مسئلہ ہے جو اس مصنوعی تقسیم کے باوجود اب بھی ہندوستان اور پاکستان میں ایک ہی ملت ہے۔

اب سوال یہ ہے کہ ان چار کروڑ مسلمانوں کو بچانے، اور ہندوستان میں اسلام کی دعوت کو زندہ اور تازہ رکھنے کے لئے ہم کیا کر سکتے ہیں؟ اب تک چونکہ قومی حیثیت سے ہمارا مدار کار بالکل مسلم لیگ کے نظام اور اس کی قیادت پر رہا ہے اس لئے یہ سوال لازماً اسی کی طرف پھرتا ہے۔ کیا تقسیم سے پہلے مسلم لیگ کی قیادت عظمٰی نے اس مسئلے کا کوئی حل تجویز کیا تھا؟ کیا تقسیم کے بعد ہندوستان میں مسلم لیگ کی سیاست اور قیادت کے لئے کام کرنے کا اب کوئی موقع ہے؟ کیا پاکستانی مسلم لیگ اس بارے میں

اپنے پاس کوئی لائحۂ عمل رکھتی ہے ؟ کیا پاکستان کی موجودہ حکومت اس قابل ہے کہ ہندو[illegible] مسلمانوں کی قسمت پر کوئی اچھا اثر ڈال سکے یا ہندوستان میں اسلام کے مستقبل کو درخشاں نہیں تو کم از کم محفوظ ہی کرنے کے لئے کچھ کر سکے ؟ اگر ان سوالات کا کوئی جواب ہے تو اسے معلوم کر کے ہم بہت خوش ہونگے۔ اگر نہیں ہے تو اس کے صاف معنی یہ ہیں کہ جب تک ہمارے قومی معاملات کی سربراہ کاری موجودہ سیاست وقیادت کے ہاتھ میں ہے، اپنی ملت کے اس سب سے بڑے مسئلے کا کوئی حل ہمارے لئے ممکن نہیں ہے، اور یہی سیاست وقیادت ہماری سربراہ کار رہی تو ہمیں چند سال کے اندر یہ دیکھنے کے لئے تیار رہنا چاہیئے کہ واگہ سے راس کماری تک اور مشرقی بنگال کی سرحدوں سے کاٹھیاواڑ کے سواحل تک کا پورا علاقہ اسلام سے خالی ہو جائے !

دوسرے مسائل پاکستان سے متعلق ہیں۔ عموماً ان سب کو لپیٹ کر صرف ایک بڑا مسئلہ ہمارے سامنے پیش کیا جاتا ہے جس کا عنوان ہے "پاکستان کا دفاع اور استحکام" اور اس کا حل یہ پیش کیا جاتا ہے کہ سب پاکستانی مل کر ایک ہو جائیں اور فوجی حیثیت سے مضبوط ہوں۔ لیکن تھوڑا سا تجزیہ کرنے ہی پر یہ بات کھل جاتی ہے کہ پاکستان کا دفاع واستحکام کوئی ایک سادہ سا مسئلہ نہیں ہے بلکہ بہت سے مسائل کا مجموعہ ہے، اور اس کا حل بھی اتنا سادہ نہیں ہے جتنا اسے سمجھ لیا گیا ہے۔ کیا ایک ملک جس کے اخلاق کو گھن لگا ہوا ہو محض اسلحہ اور فوجی تربیت کے [illegible] پر کھڑا ہو سکتا ہے ؟ کیا ایک ملک جس کے عناصر ترکیبی کو ایک دوسرے سے پھاڑنے اور باہم متصد[illegible]نے کے لئے بہت سے طاقت ور اسباب موجود ہوں بس "ایک ہو جاؤ" کی تسبیحیں پڑھنے سے واقعی ایک ہو سکتا ہے ؟ پس بجائے اس کے کہ ہم سادگی وسادہ لوحی سے خود کام لیں یا دوسروں کو سادہ لوح فرض کر کے ان کی توجہ حقیقی مسائل سے ہٹانے اور فرضی مسائل کی طرف پھیرنے کی کوشش کریں، ہمیں واضح طور پر یہ دیکھنا چاہیئے کہ فی الواقع پاکستان کا بقا، وتحفظ اور اس کا استحکام کن مسائل سے وابستہ ہے اور ہم کس طرح انہیں حل کر سکتے ہیں۔

اولین مسئلہ ملک کے اخلاق کا ہے جو تشویشناک حد تک گر چکے ہیں۔ ہماری تمام مشکلات میں سب سے زیادہ اخلاق ہی کی خرابیاں کارفرما ہیں۔ اس بگاڑ کا زہر اتنے وسیع پیمانے پر ہماری سوسائٹی میں پھیل گیا ہے اور اتنا گہرا اُتر چکا ہے کہ اگر ہم اسے اپنا قومی دشمن نمبر ایک قرار دیں تو ہرگز مبالغہ نہیں ہے۔ کوئی بیرونی خطرہ ہمارے لئے اتنا خوفناک نہیں ہے جتنا یہ اندرونی خطرہ ہے۔ یہ ہماری قوت حیات کو کھا گیا ہے اور کھائے چلا رہا ہے۔

پچھلے سال کے فسادات میں بداخلاقی کا جو طوفان اُٹھا تھا وہ ہماری آبادی کے ایک بہت بڑے حصّہ کو بہالے گیا۔ قتل وخون، آتش زنی، اور عورتوں کے بھگانے کی مشق تو شاید ہزاروں ہی کو ہوئی ہوگی، لیکن لوٹ مار کی آلائش نے لاکھوں کو ملوث کر کے چھوڑا۔ اس اخلاقی زوال کی وسعت کا اندازہ اس سے کیا جا سکتا ہے کہ ایک گاؤں کی ڈھائی ہزار آبادی میں صرف ایک شخص ایسا نکلا جس نے لوٹ میں حصّہ لینے سے پرہیز کیا تھا، اور ایک قصبہ کے سات سو گھروں میں سے بمشکل ۳۵ گھر ایسے پائے گئے جن میں لوٹ کا مال نہ پہنچا تھا۔ پھر ان لٹیروں میں محض جاہل عوام اور بازاری لوگ ہی شامل نہ تھے۔ بڑے بڑے شرفا اور معززین، اعلیٰ درجہ کے تعلیم یافتہ، سوسائٹی اور حکومت میں بڑے مرتبے رکھنے والے حضرات بھی اسی بہتی گنگا ہے رہے تھے، بلکہ وہ تو اس میں خوب جی بھر کر نہائے پولیس کے چھوٹے بڑے افسر، امن وانتظام کے ٹیٹ، حکومت کے اعلیٰ سے اعلیٰ عہدہ دار، بڑے بڑے نامور قومی کارکن، اسمبلی کے ممبر، اور بعض وزراء تک اس گندگی میں غوطہ لگا گئے۔ یہ واقعات کسی سے چھپے ہوئے نہیں ہیں۔ ایک دُنیا ان کو جانتی ہے اور شتر مرغ کی طرح ریت میں منہ چھپانے سے کچھ حاصل نہیں۔ یہ حقیقت اب کھُل چکی ہے کہ ہمارے اخلاق کے جوڑ بند بری طرح ڈھیلے ہوگئے ہیں۔ ہم میں ہزارہا آدمی قتل وخون کے مشّاق موجود ہیں، ہزاروں ایسے لوگ ہیں جو موقع ملنے پر بد سے بدتر جرائم کا ارتکاب کر سکتے ہیں، اور نیچے سے لیکر اونچے طبقوں تک کم از کم ۹۵ فیصدی تعداد اُن لوگوں کی ہے جنھیں حرام کا مال سمیٹنے میں قطعاً کوئی تامل نہیں ہوتا، بشرطیکہ انھیں قانون کی گرفت

سے محفوظ رہنے کا اطمینان ہو۔

ان حالات میں ہمارے لئے یہ کوئی وجہ تسلی نہیں ہے کہ اس سے بدرجہا زیادہ بدتر اخلاقی صفات کا ظہور ہندوستان میں ہندوؤں اور سکھوں سے ہوا ہے۔ جو زہر انھوں نے کھایا اس کی فکر انہیں ہو یا نہ ہو، ہمیں تو اس زہر کی فکر ہے جو ہماری رگوں میں اتر گیا ہے۔ کیا مشتاق مجرموں اور بے باک خائنوں کی اتنی کثیر تعداد اپنے اندر لئے ہوئے ہم اپنی قومی زندگی کو مستحکم بنا سکتے ہیں؟ کیا وہ بداخلاقیاں جو کل غیروں کی جان مال اور عصمت کے معاملے میں برتی گئی تھیں اُن کے ساتھ ہی ختم ہوگئیں اور اپنا کوئی پائدار اثر ہماری سیرت و کردار پر نہیں چھوڑ گئیں؟ کیا یہ بگڑے ہوئے اخلاق اب خود اپنوں کے ہاتھ صاف کرنے سے رک کے رہ جائینگے؟

ایک سال کا تجربہ ہمیں بتا رہا ہے کہ جس اخلاقی زوال کی خبر گذشتہ فسادات نے دی تھی وہ وقتی اور محدود نہ تھا۔ دراصل وہ ایک نہایت خوفناک مرض کی حیثیت سے ہمارے اندر اب بھی موجود ہے اور ہماری قومی زندگی کے ہر شعبے کو خراب کر رہا ہے۔ پاکستان بننے کے بعد جو دشواریاں فطرۃً ایک نئی مملکت کو پیش آیا کرتی ہیں وہ تو ہمیں پیش آنی ہی تھیں، اور جو مصائب انگریز ہندو اور سکھ کی باہمی سازش سے ہم پر نازل ہوئے وہ بھی اپنی جگہ تھے، لیکن یہ سب کچھ بڑی آسانی کے ساتھ انگیز کیا جا سکتا تھا اگر ہمارے عوام و خواص اور ہمارے [illegible] کاروں کے اخلاق اتنے بگڑے ہوئے نہ ہوتے۔ یہ واقعہ ہے، اور اس سے انکار نہیں کیا جا سکتا، کہ اخلاق کی خرابیوں نے ہماری مشکلات اور مصیبتوں کو، جتنی کہ وہ تھیں، اصل سے کئی گنا زیادہ بڑھا دیا۔

مثال کے طور پر "مہاجرین" کے مسئلے کو لیجئے جو پاکستان بنتے ہی ایک پہاڑ کی طرح ہم پر نازل ہوا۔ بلاشبہ ایک ملک کے لئے اس سے بڑی کوئی مصیبت نہیں کہ اس پر ساٹھ ستر لاکھ بے سروسامان آدمی یک لخت لا کر ڈال دئے جائیں۔ لیکن غور سے دیکھئے کہ اس طرح جو مشکلات حقیقۃً رونما ہوئی تھیں ان پر کتنا اضافہ ہماری اپنی اخلاقی خرابیوں نے کر دیا۔

ہندوؤں اور سکھوں نے جو عمارات، سامان، اموال، دکانیں، کارخانے، زمینیں اور دوسری چیزیں پاکستان میں چھوڑی تھیں، اگر ان پر خود پاکستان کے باشندے، حکومت کے عمال اور قومی کارکن قبضے کر کے نہ بیٹھ جاتے تو کیا مہاجرین کو بسانے میں ہم کو وہی دقتیں پیش آسکتی تھیں جن سے اب ہم دوچار ہیں؟ مغربی پنجاب، سرحد اور سندھ کی حکومتوں سے پوچھیے کہ جانے والوں نے کیا کچھ چھوڑا تھا اور اس کا کتنا حصّہ آنے والوں کو دیا گیا اور کتنا حصّہ کن کن غیر مستحقین کو پہنچا؟ اگر یہ اعداد و شمار روشنی میں آجائیں تو دنیا یہ دیکھ کر دنگ رہ جائے کہ مہاجرین کے مسئلے کا جو زخم غیروں نے ہم کو لگایا تھا اُسے سرطان کا پھوڑا بنا دینے والے دراصل کون لوگ ہیں۔ نہیں کہا جاسکتا کہ اس حمام میں آپ کس کس کو برہنہ دیکھینگے۔

پھر جو لوگ کل تک "پاکستان زندہ باد" کے نعرے لگا رہے تھے، جن سے بڑھ کر درد قومی میں تڑپنے والا کوئی نظر نہ آتا تھا، اور جو آج بھی زبان سے بہت بڑے "مجاہد ملت" بنے ہوئے ہیں، ان میں عظیم الشان اکثریت آپ کو ایسے افراد کی نظر آئیگی جو پاکستان بننے کے بعد ہر زاویے سے اس کی کشتی میں سوراخ کیے جارہے ہیں۔ یہ رشوت خواریاں، یہ خیانتیں، یہ غبن، یہ قومی خرچ پر اقربا پروریاں اور دوست نوازیاں، یہ فرائض سے غفلت، یہ ڈسپلن سے گریز، یہ غریب قوم کی دولت پر عیاشیاں، جن کا ایک طوفان سا ہمارے نظام حکومت کے ہر شعبے میں برپا ہے اور جس میں بکثرت چھوٹے اہلکاروں سے لیکر بہت سے عالی مقام حکام اور وزراء تک آلودہ ہیں، کیا یہ سب پاکستان کو مضبوط کرنے والی چیزیں ہیں؟ یہ دوکانوں اور کارخانوں کی ناجائز تقسیم جس کی بدولت ملک کی صنعت و تجارت کا بڑا حصّہ نا اہل و ناتجربہ کار ہاتھوں میں چلا گیا ہے، کیا یہ پاکستان کی طاقت کو مستحکم کرنے والی چیز ہے؟ یہ پبلک کا بالعموم حکومت کے ٹیکس ادا کرنے سے گریز کرنا اور ان سے بچنے کے لئے، نیز دوسرے ناجائز فوائد حاصل کرنے کے لئے سرکاری ملازموں کو رشوتیں دینا، اور جہاں بھی قانون کی گرفت سے بچ نکلنے کی اُمید ہو پبلک فنڈ کا بڑے سے بڑا نقصان کرنے میں بھی تامل نہ کرنا کیا یہی وہ چیزیں ہیں جن سے پاکستان مضبوط ہوسکتا ہے؟ ملک کے باشندوں کی اخلاقی حالت اس قدر گرچکی ہے کہ ہندوستان سے آنے والے مہاجرین کی لاشیں جب واگہ اور لاہور کے درمیان پٹی سڑرہی تھیں اور کیمپوں میں بھی موت کا بازار گرم تھا اس وقت ۱۲-۱۳ لاکھ مسلمانوں کے شہر میں سے چند ہزار نہیں، چند سو آدمی بھی ایسے نہ نکلے جو اپنے ان بھائیوں کو دفن کرنے کی زحمت اٹھاتے۔ متعدد مثالیں ہمارے علم میں ایسی ہیں کہ کوئی مہاجر مرگیا ہے اور اس کے عزیزوں کو نماز جنازہ پڑھنے کے لئے اُجرت پر آدمی فراہم کرنے پڑے ہیں۔ یہاں تک بھی نوبت پہنچی ہے کہ سرحد کے قریب کسی گاؤں میں مہاجرین کو زمینیں دی گئیں اور مقامی مسلمانوں نے سرحد پار سے سکھوں کو مِلا کر ان پر حملہ کرا دیا تاکہ یہ بھاگ جائیں

اور زمین ہمارے قبضہ میں رہ جائے۔ حد یہ ہے کہ قوم کی جو بیٹیاں ہندوستان کے ظالموں سے بچ کر آگئی تھیں ان کی عصمتیں یہاں خود اپنے بھائیوں کے ہاتھوں محفوظ نہ رہ سکیں ـــــ اس قسم کے واقعات شاذ نہیں ہیں بلکہ بکثرت ہمارے علم میں آئے ہیں، اور ان شرمناک جرائم کے مرتکب صرف عام تہدے ہی نہیں تھے ــــ کیا اتنے شدید اخلاقی تنزل کے ہوتے ہم یہ اُمید کرسکتے ہیں کہ کسی بڑی اندرونی یا بیرونی مصیبت کے مقابلے میں ہم مضبوطی کے ساتھ کھڑے ہوسکینگے؟ اور کیا یہ اخلاقی تنزل اپنے ملک کی تعمیر ہی کے لئے ہماری کسی اسکیم کو کامیابی کے ساتھ چلنے دیگا؟

تھوڑی دیر کے لئے ہم اس سوال کو جانے دیتے ہیں کہ ہماری قیادت نے سیاسی تحریک کے ساتھ قوم کی اخلاقی طاقت کو سنبھالنے کی فکر کیوں نہ کی؟ ہم پوچھتے ہیں کہ اب وہ اس کے لئے کیا کر رہی ہے؟ اخلاق بنانے اور سنوارنے کا کیا سروسامان اس کے پاس ہے؟ کیا تدابیر اس کے پیش نظر ہیں؟ کیا لائحہ عمل اس نے بنایا ہے؟ یہ ایک اہم سوال ہے جس کا واضح جواب ہمیں ملنا چاہیئے۔ اگر اس کے جواب میں ان نصائح کی طرف اشارہ کیا جائے جو کبھی کبھی ریڈیو اور سرکاری پریس اور تقریروں کے ذریعہ سے پبلک کو اور حکومت کے چھوٹے اہلکاروں کو کی جاتی رہتی ہیں تو ہم پہلے ہی کہے دیتے ہیں کہ اس طرح کی طفل تسلیوں سے ہمیں معاف رکھا جائے۔ اس لئے کہ بداخلاقی کے اصل سرچشمے تو خود قصرِ قیادت کے ستونوں میں شامل ہیں۔ کارفرمائی اور کارپردازی کی باگیں تو اس وقت ایسے لوگوں کے ہاتھوں میں ہیں جن کی بڑی اکثریت ہی کے دم قدم سے بداخلاقی کا بازار گرم ہے۔ پھر بھلا خیانت کی زبان سے امانت کا سبق، خود غرضی کی زبان سے ایثار کا وعظ اور گناہ کی زبان سے نیکی کا درس انسانی فطرت نے کب قبول کیا ہے کہ یہاں اس کے کارگر ہونے کی توقع کی جائے!

دوسرا مسئلہ جو پاکستان کی زندگی، اس کے بقاء اور اس کے استحکام کے لئے بڑی اہمیت رکھتا ہے وہ یہ ہے کہ پاکستان جن عناصر پر مشتمل ہے انہیں کس طرح جوڑ کر ایک بنیان مرصوص بنایا جائے۔ یہ عناصر اس وقت خندہ کے ساتھ مائل انتشار نظر آرہے ہیں، اور ظاہر ہے کہ کسی چیز کے عناصر ترکیبی ہی اگر مجتمع اور باہم پیوستہ نہ ہوں تو اس کے وجود کا برقرار رہنا سخت دشوار ہے۔ اس کے اجزاء وجود میں پراگندگی کا رجحان یہ معنی رکھتا ہے کہ اس کی اپنی تعمیر ہی میں خرابی کی صورت مضمر ہے۔ لہٰذا اگر یہ واقعہ ہے، اور کون ہے جو اس کا انکار کرسکتا ہو، کہ پاکستان کے ترکیبی عناصر میں جمع و تالیف کے بجائے کچھ انتشار و پراگندگی کے رجحانات پائے جاتے ہیں اور کچھ قوتیں ان کو بڑھانے میں لگی ہوئی ہیں، تو ہمیں سمجھنا چاہیئے کہ ہمارے بند استحکام، بلکہ عین ہماری بندش وجود ہی میں یہ ایک خطرناک رخنہ ہے جسے دور کئے بغیر ہم اپنے آپ کو محفوظ نہیں رکھ سکتے۔

پاکستان جن عناصر پر مشتمل ہے ان میں تین تفریقیں اس وقت بالکل نمایاں ہیں۔

پہلی تفریق مہاجرین اور غیر مہاجرین کے درمیان ہے۔ ہماری آبادی میں مہاجرین کی تعداد اس وقت ۷۰ لاکھ سے متجاوز ہو چکی ہے اور یہ تعداد روز افزوں ہے، کیونکہ ہندوستان کے ہر حصے سے مسلمان اکثر و بیشتر برابر پاکستان کی طرف چلے آرہے ہیں۔ مشرقی ہند کے لوگوں کا رخ مشرقی پاکستان کی طرف ہے اور باقی ہندوستان کے لوگ مغربی پاکستان کی راہ لے رہے ہیں۔ یہ نیا عنصر اب ہماری آبادی کا ایک مستقل عنصر ہے اور تعداد کے لحاظ سے کوئی معمولی عنصر نہیں ہے۔ لیکن متعدد اسباب ایسے ہیں جو نئے اور پرانے عناصر کو مل کر ایک قوم بننے سے روک رہے ہیں۔ کچھ تو زبان، تہذیب، معاشرت اور عادات و خصائل کے قدرتی اختلافات ہیں جو بہرحال ایک مدت تک یگانگت میں مانع ہوا ہی کرتے ہیں۔ مگر ان پر غیر معمولی اضافہ جس چیز نے کر دیا ہے وہ یہ ہے کہ مہاجرین اور غیر مہاجرین دونوں میں جاہلیت کے تعصبات اور نفسانی خود غرضیاں کارفرما ہیں۔ یہ چیز ہر جگہ ان دونوں عناصر کو پھاڑ رہی ہے، ان کو مخالف جتھوں کی شکل میں منظم کر رہی ہے، ان کے درمیان آویزش کی صورتیں پیدا کر رہی ہے اور دونوں طرف کے تنگ نظر اور خود غرض مفسدین ان کو باہم لڑا رہے ہیں۔

دوسری تفریق جغرافی، نسلی اور لسانی ہے۔ پاکستان اول تو دو ایسے خطوں پر مشتمل ہے جن کے درمیان ایک ہزار میل سے زیادہ کا فاصلہ ہے۔ پھر یہ خطے بھی اپنی اپنی جگہ اندرونی وحدت نہیں رکھتے بلکہ مختلف اجزا سے مرکب ہیں اور ہر جزو دوسرے جزو کے خلاف تعصب رکھتا ہے۔ اس وقت درحقیقت ہم ایک قوم نہیں ہیں بلکہ پانچ مختلف قومیں ہیں جو مصنوعی طور پر ایک سیاسی وحدت میں منسلک ہو گئی ہیں، یعنی سندھی، بلوچی، پٹھان، پنجابی اور بنگالی۔ ان میں سے ہر ایک قوم کے اندر علیحدگی کا رجحان شدت کے ساتھ پایا جاتا ہے اور بعض نادان گروہ اس کو شدید تر کرنے کی پیہم جدوجہد کر رہے ہیں۔

تیسری تفریق معاشی ہے۔ امیر اور غریب، زمیندار اور کاشتکار، مزدور اور سرمایہ دار، بڑی تنخواہیں پانے والے افسر اور چھوٹے اہلکار، یہ مختلف گروہ ہیں جن کو معاشی بے انصافیوں نے ایک دوسرے سے پھاڑ دیا ہے۔ ان کے درمیان اخوت اور ہمدردی کا تعلق نہیں ہے بلکہ حسد اور بغض کا تعلق ہے۔ یہ ایک دوسرے کے رفیق اور حامی و ناصر نہیں ہیں بلکہ حریف اور مدمقابل ہیں۔ ان کی کشمکش بھی روز بروز بڑھ رہی ہے اور ہمارے اندر ایک گروہ ایسا موجود ہے جس کا مستقل فلسفہ ہی یہ ہے کہ انہیں ملا کر ایک کر دینے کا خیال باطل ہے اور حق صرف یہ ہے کہ ان کو باہم لڑا دیا جائے۔

سوال یہ ہے کہ یہ مختلف تفریقیں، جو ہماری قوم اور ریاست کو پارہ پارہ کر دینے پر تلی ہوئی ہیں، جن کو نشو ونما دینے کے لئے گہرے داخلی اسباب بھی موجود ہیں، اور جنہیں بھڑکانے کے لیے خارجی محرکات کی بھی کمی نہیں ہے، آخر کس طریقے سے مٹائی جا سکتی ہیں؟ طاقت کے ذریعہ سے ان کو دبا کر ریاست کی سیاسی وحدت اور اس کے امن کو برقرار رکھنا ایک حد تک ممکن ہے، مگر یہ چیز دلوں کو جوڑ کر وہ قلبی وحدت تو ہرگز پیدا نہیں کر سکتی جو ریاست کی اندرونی ترقی اور بیرونی خطرات کے مقابلہ میں اس کی متحدہ مدافعت کے لئے ضروری ہے۔ پھٹے ہوئے دل اور کھنچے ہوئے ہاتھ نہ تعمیر میں تعاون کر سکتے ہیں اور نہ مدافعت ہی میں بنیان مرصوص بن کر کھڑے ہو سکتے ہیں۔ قومیت کا پرچار بھی اس معاملہ میں بے بس ہے۔ ہندوستان میں ہم اس کا نتیجہ دیکھ چکے ہیں۔ مغربی تصورات کے مطابق قومیت کی تبلیغ و تلقین وہاں جتنی بڑھتی گئی، اس نے ملک کی آبادی میں وحدت پیدا کرنے کے بجائے ان تمام گروہوں میں اپنے امتیازی وجود کا احساس جگا دیا جو اپنے اندر قومیت کے عناصر رکھتے تھے۔ پھر معاشی اغراض کا تصادم تو وہ چیز ہے جس کے زہر کا تریاق فراہم کرنے میں قومیت جگہ جگہ ناکام ہوئی اور ہو رہی ہے۔ اب ہم معلوم کرنا چاہتے ہیں کہ ہماری موجودہ قیادت کے پاس اس مسئلہ کا کیا حل ہے اور وہ کہاں تک اس سے عہدہ برآ ہونے کی اہلیت رکھتی ہے؟

کوئی شخص یہ گمان نہ کرے کہ ہم اُن دوسرے مسائل کی اہمیت سے غافل ہیں جو اس وقت پاکستان کی نوزائیدہ مملکت کو درپیش ہیں۔ بلاشبہ وہ مالی، صنعتی، انتظامی، دفاعی اور خارجی مسائل بھی اپنی جگہ کافی اہم ہیں جن سے ہم اس مملکت کی پیدائش کے بعد دوچار ہوئے۔ کوئی نہیں کہتا کہ ان کی طرف توجہ نہ کی جائے۔ نہ اُن واقعی خدمات کا انکار کرنا قرینِ انصاف ہے جو اس سلسلہ میں موجودہ قیادت نے انجام دیں۔ لیکن جہاں تک ہم سمجھتے ہیں مسلمانوں کی حیات قومی کے لئے اس وقت سب سے بڑے مسئلے یہی تین ہیں جن کا ذکر ہم نے کیا ہے، اور قیادت کا اصل محکِّ امتحان یہ ہے کہ وہ انہیں صحیح طور پر حل کرنے کی اہلیت، فکری اور اخلاقی حیثیت سے کہاں تک اپنے اندر رکھتی ہے۔

مقالات

اسلامی حکومت میں ذمیوں کے حقوق

حال میں پاکستان کی دستور ساز اسمبلی نے ایک سوال نامہ جاری کیا ہے جس میں اس مسئلے پر استصواب کیا گیا ہے کہ پاکستان کی مرکزی اور صوبائی حکومتوں میں اقلیتوں کے حقوق کیا ہونے چاہئیں۔ ہمیں نہیں معلوم کہ اسمبلی کے کام کا خاکہ جن لوگوں نے مرتب کیا ہے ان کے پیش نظر کیا ترتیب کار ہے۔ لیکن بادی النظر میں یہ بات بالکل عجیب معلوم ہوتی ہے کہ ابھی تک اسمبلی نے اپنے مقاصد (Objectives) تو متعین نہیں کئے ہیں اور پہلے ہی یہ سوالات چھیڑنے شروع کر دئے ہیں کہ ریاست کے دستور میں اقلیتوں کے حقوق کیا ہوں اور شہریوں کے بنیادی حقوق کیا قرار پائیں حالانکہ سب سے پہلے جو چیز طے کرنے کی ہے وہ یہ ہے کہ ہماری زیر تشکیل ریاست کی نوعیت کیا ہوگی۔ اسی سوال کے تصفیہ پر دوسرے سوالات کا تصفیہ منحصر ہے۔ اگر اس ریاست کو ایک اسلامی ریاست ہونا ہے تو لامحالہ غیر مسلموں کے حقوق اور شہریوں کے بنیادی حقوق اور دوسرے تمام اُمور میں ہم کو اسلامی شریعت کی طرف رجوع کرنا ہوگا۔ اور اگر اسے ایک "بے دین جمہوری قومی ریاست" بننا ہے تو پھر یہ سارے مسائل کسی اور بنیاد پر حل کئے جائیں گے۔ لہٰذا نوعیتِ ریاست کا تعین کرنے سے پہلے اِن ثانوی مسائل کے تصفیہ سے کام کی ابتدا کرنا ایک غلط ترتیب کار ہے اور اس کی مثال ایسی ہے جیسے تعمیر مکان کی ابتدا، دوسری منزل سے کی جائے۔

تاہم چونکہ یہ مسئلہ چھڑ گیا ہے اس لئے ہم یہ بتانا مناسب سمجھتے ہیں کہ ایک اسلامی ریاست میں غیر مسلم شہریوں کے حقوق کیا ہیں اور اسلام کے اصول پر زیادہ سے زیادہ کیا ہو سکتے ہیں۔

اسلامی حکومت میں غیر مسلموں کے حقوق پر بحث کرنے سے پہلے یہ ذہن نشین کر لینا ضروری ہے کہ اسلام کی حکومت دراصل ایک اصولی (Ideological) حکومت ہے اور اس کی نوعیت ایک قومی جمہوری (National democratic) حکومت سے قطعاً مختلف ہے۔ دونوں قسم کی ریاستوں کے اس نوعی فرق کا مسئلۂ زیر بحث پر کیا اثر پڑتا ہے۔ اس کو حسب ذیل نکات سے اچھی طرح سمجھا جا سکتا ہے:۔

(۱) اسلامی حکومت اپنے حدود میں رہنے والے لوگوں کو اس لحاظ سے تقسیم کرتی ہے کہ کون ان اصولوں کو مانتے ہیں جن پر حکومت کی بنا رکھی گئی ہے اور کون انہیں نہیں مانتے یعنی مسلم اور غیر مسلم۔

(۱) قومی حکومت انہیں اس لحاظ سے تقسیم کرتی ہے کہ کون لوگ اُس قوم سے تعلق رکھتے ہیں۔ جو دراصل ریاست کی بنانے اور چلانے والی ہے، اور کون لوگ اس سے تعلق نہیں رکھتے۔ آج کل کی اصطلاح میں اس کے لئے اکثریت اور اقلیت کے الفاظ استعمال کئے جاتے ہیں۔

(۲) اسلامی حکومت کو چلانا دراصل اُن لوگوں کا کام ہوتا ہے جو اس کے اصولوں کو مانتے ہوں۔ وہ اپنے انتظام میں غیر مسلموں کی خدمات تو ضرور استعمال کر سکتی ہے، مگر رہنمائی و کارفرمائی کے مناصب انہیں نہیں دے سکتی۔

(۲) قومی حکومت اپنی رہنمائی و کارفرمائی کے لئے صرف اپنے افراد قوم ہی پر اعتماد کرتی ہے اور دوسری قلیل التعداد قومیں جو اس کے شہریوں میں شامل ہوں، اس اعتماد کی مستحق نہیں ہوتیں۔ یہ بات چاہے صاف صاف کہی نہ جاتی ہو، مگر عملاً ہوتا اسی طرح ہے۔ اور اگر اقلیت کے کسی فرد کو کبھی کوئی کلیدی منصب

دیا بھی جاتا ہے تو یہ محض ایک نمائشی حرکت ہوتی ہے۔ پالیسیوں کی تشکیل میں فی الحقیقت اس کا کوئی دخل نہیں ہوتا۔

(۳) اسلامی حکومت عین اپنی نوعیت ہی کے لحاظ سے اس بات پر مجبور ہے کہ مسلموں اور غیر مسلموں کے درمیان واضح امتیاز قائم کرے اور صاف صاف بتادے کہ وہ غیر مسلموں کو کیا حقوق دے سکتی ہے اور کیا نہیں دے سکتی۔

(۳) قومی حکومت کے لئے یہ منافقانہ چالبازی آسان ہے کہ وہ ملک کے تمام باشندوں کو نظری حیثیت سے ایک قوم قرار دیکر کاغذ پر سب کو مساوی حقوق دیدے، مگر عملاً اکثریت اور اقلیت کا پورا امتیاز قائم رکھے اور زمین پر اقلیتوں کو کسی قسم کے حقوق نہ دے

(۴) اسلامی حکومت کو اپنے نظام کے اندر غیر مسلم عناصر کی موجودگی سے جو پیچیدگی پیش آتی ہے اسے وہ اس طرح حل کرتی ہے کہ انہیں متعین حقوق کا ذمہ (Guarantee) دیکر مطمئن کر دیتی ہے، اپنے اصولی نظام کے حل وعقد میں ان کی مداخلت روک دیتی ہے، اور ان کے لئے ہر وقت یہ دروازہ کھلا رکھتی ہے کہ اگر اسلام کے اصول انہیں پسند آجائیں تو وہ انہیں قبول کر کے حکمراں جماعت میں شامل ہو جائیں

(۴) قومی حکومت کو اپنے نظام میں غیر قومی عناصر کی شمولیت سے جو پیچیدگی پیش آتی ہے اسے حل کرنے کے لئے وہ تین مختلف تدبیریں اختیار کرتی ہے۔ ایک یہ کہ ان کی انفرادیت کو بتدریج مٹا کر اپنے اندر جذب کرلے۔ دوسرے یہ کہ ان کی ہستی کو محو کرنے کے لئے قتل و غارت اور اخراج کے ظالمانہ طریقے اختیار کرے تیسرے یہ کہ ان کو اپنے اندر اچھوت بنا کر رکھ دے۔ یہ تینوں تدبیریں دنیا کی قومی جمہوری ریاستوں میں بکثرت اختیار کی گئی ہیں، اب تک کی جارہی ہیں، اور آج ہندوستان میں خود مسلمانوں کو ان کا تلخ تجربہ

ہو رہا ہے ۔

(۵) اسلامی حکومت ذمی غیر مسلموں کو وہ تمام حقوق دینے پر مجبور ہے جو شریعت نے ان کے لئے مقرر کئے ہیں۔ ان حقوق کو سلب کرنے یا ان میں کمی کر دینے کا اختیار کسی کو نہیں ہے البتہ مسلمانوں کو یہ اختیار ضرور حاصل ہے کہ وہ ان حقوق کے علاوہ کچھ مزید حقوق انھیں عطا کریں بشرطیکہ یہ اضافہ اسلام کے اصولوں سے متصادم نہ ہوتا ہو۔

(۵) قومی جمہوری حکومت میں اقلیتوں کو جو حقوق بھی دئے جاتے ہیں وہ اکثریت کے عطا کردہ ہوتے ہیں، اور اکثریت جس طرح انھیں عطا کرنے کا حق رکھتی ہے اسی طرح وہ ان میں کمی بیشی کرنے اور بالکل سلب کر لینے کا بھی حق رکھتی ہے۔ پس درحقیقت اس نظام میں اقلیتیں سراسر اکثریت کے رحم پر جیتی ہیں اور اُن کے لئے ابتدائی انسانی حقوق تک کی کوئی پائدار ضمانت نہیں ہوتی۔

یہ بنیادی اختلافات ہیں جو ذمیوں کے ساتھ اسلام کے سلوک اور اقلیتوں کے ساتھ قومی جمہوریتوں کے سلوک کو ایک دوسرے سے بالکل ممتاز کر دیتے ہیں۔ جب تک انہیں پیش نظر نہ رکھا جائے، انسان خلط مبحث سے نہیں بچ سکتا اور نہ اِس غلط فہمی سے محفوظ رہ سکتا ہے کہ موجودہ زمانے کی قومی جمہوریتیں کاغذ پر اپنے دستوروں میں اقلیتوں کو بالکل مساویانہ حقوق دیتی ہیں۔

اِن ضروری توضیحات کے بعد اب ہم اپنے اصل موضوع کی طرف رجوع کرتے ہیں

غیر مسلم رعایا کی اقسام

اسلامی قانون اپنی غیر مسلم رعایا کو تین اقسام پر تقسیم کرتا ہے۔

ایک وہ جو کسی صلح نامے یا معاہدے کے ذریعے سے اسلامی حکومت کے تحت آئے ہوں،

دوسرے وہ جو لڑنے کے بعد شکست کھا کر مغلوب ہوئے ہوں،

تیسرے وہ جو جنگ اور صلح دونوں کے سوا کسی اور صورت سے اسلامی ریاست میں شامل ہوئے ہوں

یہ تینوں اگرچہ ذمیوں کے عام حقوق میں یکساں شریک ہیں، لیکن پہلے دونوں گروہوں کے احکام

میں تھوڑا سا فرق بھی ہے۔ اس لئے اہل الذمہ کے عام حقوق کی تفصیلات بیان کرنے سے پہلے ہم ان مخصوص گروہوں کے جدا جدا احکام بیان کریں گے۔

معاہدین | جو لوگ جنگ کے بغیر یا دوران جنگ میں اطاعت قبول کرنے پر راضی ہو جائیں اور حکومت اسلامی سے مخصوص شرائط طے کرلیں ان کے لئے اسلام کا قانون یہ ہے کہ ان کے ساتھ تمام معاملات ان شرائط صلح کے تابع ہوں گے جو ان سے طے ہوئی ہیں۔ دشمن کو اطاعت پر آمادہ کرنے کے لئے چند فیاضانہ شرائط طے کرلینا اور پھر جب وہ پوری طرح قابو میں آجائے تو اس کے ساتھ مختلف برتاؤ کرنا آج کل کی مہذب قوموں کے سیاسی معمولات میں سے ہے، مگر اسلام اس کو ناجائز بلکہ حرام اور گناہ عظیم قرار دیتا ہے۔ اس کے نزدیک یہ ضروری ہے کہ جب کسی قوم کے ساتھ کچھ شرائط طے ہو جائیں (خواہ وہ مرغوب ہوں یا نہ ہوں) تو اس کے بعد ان شرائط سے یک سر مو بھی تجاوز نہ کیا جائے، بلا لحاظ اس کے کہ فریقین کی اعتباری حیثیت اور طاقت و قوت (Relative Position) میں کتنا ہی فرق آجائے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں:۔

لعلکم تقاتلون قوما فتظھرون علیھم فیتقونکم باموالھم دون انفسھم و ابنائھم (وفی روایۃ فیصالحونکم علی صلح) فلا تصیبوا منھم فوق ذلک فانہ لا یصلح لکم[1]

اگر تم کسی قوم سے لڑو اور اس پر غالب آجاؤ اور وہ قوم اپنی اور اپنی اولاد کی جان بچانے کے لئے تم کو خراج دینا منظور کرلے (ایک دوسری حدیث میں ہے کہ تم سے صلح نامہ طے کرلے) تو پھر بعد میں اس مقررہ خراج سے ایک حبہ بھی زائد نہ لینا کیونکہ وہ تمہارے لئے ناجائز ہوگا۔

ایک اور حدیث میں ہے کہ آنحضرت صلعم نے فرمایا:۔

الا من ظلم معاھدا او انتقصہ او کلفہ فوق طاقتہ او اخذ منہ شیئا بغیر

خبردار! جو شخص کسی معاہد پر ظلم کرے گا یا اس کے حقوق میں کمی کریگا یا اس کی طاقت سے زیادہ

---

[1] ابوداؤد کتاب الجہاد

طیب نفس فانا حجیجہ یوم القیامۃ[1]	اس پر بار ڈالیگا، یا اس سے کوئی چیز اس کی مرضی کے خلاف وصول کرے گا، اس کے خلاف قیامت کے دن میں خود مستغیث بنونگا،

ان دونوں حدیثوں کے الفاظ عام ہیں اور ان سے یہ قاعدہ کلیہ مستنبط ہوتا ہے کہ معاہد ذمیوں کے ساتھ صلحنامہ میں جو شرایط طے ہوجائیں ان میں کسی قسم کی کمی یا زیادتی کرنا ہرگز جائز نہیں ہے۔ نہ ان پر خراج بڑھایا جاسکتا ہے، نہ ان کی زمینوں پر قبضہ کیا جاسکتا ہے، نہ ان کی عمارتیں چھینی جاسکتی ہیں، نہ ان پر سخت فوجداری قوانین نافذ کئے جاسکتے ہیں، نہ ان کے مذہب میں دخل دیا جاسکتا ہے، نہ ان کی عزت و آبرو پر حملہ کیا جاسکتا ہے اور نہ کوئی ایسا فعل کیا جاسکتا ہے جو ظلم یا انتقاص، یا تکلیف مالا یطاق، یا اخذ بغیر طیب نفس کی حد میں آتا ہو۔ انہی احکام کی بنا پر فقہائے اسلام نے صلحاً فتح ہونے والی قوموں کے متعلق کسی قسم کے قوانین مدون نہیں کئے ہیں اور صرف یہ عام قاعدہ وضع کرکے چھوڑ دیا ہے کہ ان کے ساتھ ہمارا معاملہ بالکل شرائط صلح کے مطابق ہوگا۔ امام ابو یوسف لکھتے ہیں:۔

یوخذ منھم ما صولحوا علیہ و یوفی لھم ولا یزاد علیھم[2]	ان سے وہی لیا جائیگا جس پر ان کے ساتھ صلح ہوئی ہے، ان کے حق میں صلح کی شرائط پوری کی جائیں گی، اور ان پر کچھ اضافہ نہ کیا جائیگا

مفتوحین | دوسری قسم میں وہ لوگ شامل ہیں جو آخر وقت تک مسلمانوں سے لڑتے رہے ہوں اور جنھوں نے اس وقت ہتھیار ڈالے ہوں جب اسلامی فوجیں ان کے استحکامات کو توڑ کر ان کی بستیوں میں فاتحانہ داخل ہوچکی ہوں۔ اس قسم کے مفتوحین کو جب ذمی بنایا جاتا ہے۔ تو ان کو چند خاص حقوق دئے جاتے ہیں، جن کی تفصیلات فقہی کتابوں میں موجود ہیں۔ ذیل میں ان احکام کا خلاصہ درج کیا جاتا ہے جن سے ذمیوں کی اس جماعت کی آئینی حیثیت واضح ہوتی ہے:

[1] ابو داؤد، کتاب الجہاد [2] کتاب الخراج صفحہ ۳۵

(۱) جب امام اُن سے جزیہ قبول کرلے تو ہمیشہ کے لئے عقد ذمہ قائم ہوجائیگا، اور ان کی جان و مال کی حفاظت کرنا مسلمانوں پر فرض ہوگا کیونکہ قبول جزیہ کے ساتھ ہی عصمت نفس و مال ثابت ہوجاتی ہے۔[۱] اس کے بعد امام کو یا مسلمانوں کو یہ حق باقی نہیں رہتا کہ ان کی املاک پر قبضہ کریں یا انھیں غلام بنالیں۔ حضرت عمرؓ نے حضرت ابو عبیدہؓ کو صاف لکھا تھا کہ :-

فاذا اخذت منھم الجزیۃ فلا شیئ لک علیھم ولا سبیل[۲]	جب تم ان سے جزیہ قبول کرلو تو پھر تم کو ان پر دست درازی کا کوئی حق باقی نہیں رہتا۔

(۲) عقد ذمہ قائم ہوجانے کے بعد اپنی زمینوں کے مالک وہی ہوں گے، ان کی ملکیت ان کے ورثہ کو منتقل ہوگی، اور ان کو اپنے املاک میں بیع، ہبہ، رہن وغیرہ کے حقوق حاصل ہوں گے۔[۳] اسلامی حکومت کو انہیں بے دخل کرنے کا حق نہ ہوگا۔

(۳) جزیہ کی مقدار ان کی مالی حالت کے لحاظ سے متعین کی جائے گی۔ جو مالدار ہیں ان سے زیادہ، جو متوسط الحال ہیں ان سے کم، اور جو غریب ہیں اُن سے بہت کم لیا جائیگا۔ اور جو کوئی ذریعہ آمدنی نہیں رکھتے، یا جن کی زندگی کا انحصار دوسروں کی بخشش پر ہے، ان کو جزیہ معاف کردیا جائیگا۔ اگرچہ جزیہ کے لئے کوئی خاص رقم مقرر نہیں ہے، لیکن اس کی تعیین میں یہ امر مدنظر رکھنا ضروری ہے کہ ایسی رقم مقرر کی جائے جس کا ادا کرنا ان کے لئے آسان ہو۔ حضرت عمرؓ نے مالداروں پر ایک روپیہ ماہانہ، متوسط الحال لوگوں پر آٹھ آنہ مہینہ اور غریب محنت پیشہ لوگوں پر چار آنہ مہینہ جزیہ مقرر کیا تھا۔[۴]

(۴) جزیہ صرف ان لوگوں پر لگایا جائیگا جو اہل قتال ہیں۔ غیر اہل قتال مثلاً بچے، عورتیں، دیوانے، اندھے، اپاہج، عبادت گاہوں کے خادم، راہب، سنیاسی، از کار رفتہ بوڑھے، ایسے بیمار جن کی بیماری سال کے ایک بڑے حصّہ تک ممتد ہوجائے، اور لونڈی غلام وغیرہ

[۱] بدائع الصنائع ج ۷ ص ۱۱۱
[۲] کتاب الخراج ص ۸۲
[۳] فتح القدیر ج ۴ ص ۳۵۹
[۴] کتاب الخراج ص ۳۶

جزیہ سے مستثنیٰ ہیں[۱]

۵۔ بزورِ شمشیر فتح ہونے والے شہر کے معابد پر مسلمانوں کو قبضہ کر لینے کا حق ہے۔ لیکن اس حق سے استفادہ نہ کرنا اور بطریق احسان ان کو علیٰ حالہ قائم رہنے دینا اولیٰ اور افضل ہے۔ حضرت عمرؓ کے زمانہ میں جتنے ممالک فتح ہوئے ان میں کوئی معبد نہ توڑا گیا اور نہ اس سے کسی قسم کا تعرض کیا گیا۔ امام ابو یوسف ؒ لکھتے ہیں :-

ترکت علیٰ حالہا ولم تہدم ولم یتعرض لہا[۲] — ان کو ان کے حال پر چھوڑ دیا گیا، نہ مسمار کیا گیا اور نہ ان سے کسی قسم کا تعرض کیا گیا۔

قدیم معابد کو مسمار کرنا بہرحال ناجائز ہے[۳]

ذمیوں کے عام حقوق | اب ہم ذمیوں کے وہ حقوق بیان کریں گے جن میں تینوں اقسام کے اہل الذمہ شریک ہیں۔

حفاظت جان | ذمی کے خون کی قیمت مسلمان کے خون کے برابر ہے۔ اگر کوئی مسلمان ذمی کو قتل کرے گا تو اس کا قصاص اُسی طرح لیا جائیگا جس طرح مسلمان کو قتل کرنے کی صورت میں لیا جاتا ہے۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں ایک مسلمان نے ایک ذمی کو قتل کیا تو آپ نے اس کے قتل کا حکم دیا اور فرمایا کہ :-

انا احق من وفیٰ بذمتہ[۴] — اس کے ذمہ کو وفا کرنے کا سب سے زیادہ حقدار میں ہوں۔

حضرت عمرؓ کے زمانہ میں قبیلہ بکر بن وائل کے ایک شخص نے حیرہ کے ایک ذمی کو قتل کر دیا۔

---

[۱] بدائع ج ۷، ص ۱۱۱ - ۱۱۲، فتح القدیر ج ۴ ص ۳۷۲ - ۳۷۳، کتاب الخراج ص ۷۰۔
[۲] کتاب الخراج ص ۸۳
[۳] بدائع جلد ۷، ص ۱۱۴

[۴] عنایہ شرح ہدایہ ج ۸ ص ۲۵۶، دار قطنی نے یہی حدیث ابن عمرؓ کے حوالہ سے نقل کی ہے اور اس میں " انا اکرم من وفیٰ بذمتہ " آیا ہے۔

اس پر آپ نے حکم دیا کہ قاتل کو مقتول کے حوالہ کیا جائے۔ چنانچہ وہ مقتول کے وارثوں کو دیدیا گیا اور انھوں نے اس کو قتل کردیا[۱]

حضرت عثمان کے زمانہ میں خود عبیداللہ بن عمرؓ کے قتل کا فتویٰ دیدیا گیا تھا کیونکہ انھوں نے ہرمزان اور ابولولو کی بیٹی کو اس شبہ میں قتل کردیا تھا کہ شاید وہ حضرت عمرؓ کے قتل کی سازش میں شریک تھے۔

حضرت علیؓ کے زمانہ میں ایک مسلمان ایک ذمی کے قتل میں ماخوذ ہوا۔ ثبوت مکمل ہونے کے بعد آپ نے قصاص کا حکم دے دیا۔ مقتول کے بھائی نے آکر عرض کیا میں نے خون معاف کیا۔ مگر آپ مطمئن نہ ہوئے اور فرمایا:۔

لعلهم فزعوك او هددوك — شاید ان لوگوں نے تجھے ڈرایا دھمکایا ہے۔

اُس نے جواب دیا کہ "نہیں۔ مجھے خون بہا مل چکا ہے اور میں سمجھتا ہوں کہ اس کے قتل سے میرا بھائی واپس نہیں آجائیگا" تب آپ نے قاتل کو رہا کیا اور فرمایا کہ:۔

من كان له ذمتنا فدمه كدمنا وديته كديتنا[۲] — "جو کوئی ہمارا ذمی ہو اس کا خون ہمارے خون کی طرح اور اس کی دیت ہماری دیت کی طرح ہے"

ایک دوسری روایت کے مطابق حضرت علیؓ نے فرمایا:۔

انما قبلوا عقد الذمة لتكون اموالهم كاموالنا ودماؤهم كدمائنا — انھوں نے عقد ذمہ قبول ہی اس لئے کیا ہے کہ ان کے مال ہمارے مال کی طرح اور ان کے خون ہمارے خون کی طرح ہو جائیں۔

اسی بنا پر فقہا نے یہ جزئیہ نکالا ہے کہ اگر مسلمان کسی ذمی کو بلا ارادہ قتل کرے تو اس کی دیت بھی وہی ہوگی جو مسلمان کو خطاءً قتل کرنے سے لازم آتی ہے۔[۳]

---

[۱] برہان شرح مواہب الرحمٰن ج ۳ ص ۲۸۷ — [۲] برہان جلد ۲ ص ۲۸۲

[۳] درمختار ج ۳ ص ۲۰۳

فوجداری قانون تعزیرات کا قانون ذمی اور مسلمان کے لئے یکساں ہے اور اس میں دونوں کا درجہ مساوی ہے۔ جرائم کی جو سزا مسلمان کو دی جائے گی وہی ذمی کو بھی دی جائے گی۔ ذمی کا مال مسلمان چرالے یا مسلمان کا مال ذمی چرائے، دونوں صورتوں میں سارق کا ہاتھ کاٹا جائیگا۔ ذمی کسی مرد یا عورت پر زنا کی تہمت لگائے یا مسلمان ایسا کرے، دونوں صورتوں میں ایک ہی حد قذف جاری ہوگی۔ اسی طرح زنا کی سزا بھی ذمی اور مسلمان کے لئے یکساں ہے۔ البتہ شراب کے معاملہ میں ذمیوں کے لئے استثنا ہے[۱]۔

دیوانی قانون دیوانی قانون بھی ذمی اور مسلمان کے لئے یکساں ہے اور دونوں کے درمیان کامل مساوات ہے۔ حضرت علیؓ کے ارشاد اموالھم کاموالنا کے معنی ہی یہی ہیں کہ ان کے مال کی ویسی ہی حفاظت کی جائے گی جیسی مسلمان کے مال کی ہوتی ہے اور دیوانی حقوق ہمارے اور ان کے برابر ہوں گے۔ اس مساوات کا طبیعی لازمہ یہ ہے کہ دیوانی قانون کی رو سے جتنی پابندیاں مسلمان پر عائد ہوتی ہیں وہی سب ذمی پر بھی عائد ہوں۔

تجارت کے جو طریقے ہمارے لئے ممنوع ہیں وہی ان کے لئے بھی ہیں۔ سود جس طرح ہمارے لئے حرام ہے اسی طرح ان کے لئے بھی ہے۔ البتہ ذمیوں کے لئے صرف شراب اور سور کا استثنا ہے۔ وہ شراب بنانے، پینے اور بیچنے کا حق رکھتے ہیں، اور انھیں سور پالنے کھانے اور فروخت کرنے کے بھی حقوق حاصل ہیں[۲]۔ اگر کوئی مسلمان کسی ذمی کی شراب یا اس کے سور کو تلف کردے تو اس پر تاوان لازم آئے گا۔ درالمختار میں ہے:۔

---

[۱] کتاب الخراج ص ۲۰۸ - ۲۰۹ - المبسوط ج ۹ ص ۵۷ - ۵۸ - امام مالک کے نزدیک ذمی کے لئے شراب کی طرح زنا کے معاملہ میں بھی استثنا ہے۔ وہ حضرت علی اور حضرت عمر کے اس فیصلہ سے استدلال کرتے ہیں کہ ذمی اگر زنا کرے تو اس کا معاملہ اس کے اہل ملت پر چھوڑ دیا جائے (یعنی اس کے پرسنل لا کے مطابق عمل کیا جائے)

[۲] المبسوط ج ۱۳ ص ۳۷ - ۳۸ -

ویضمن المسلم قیمۃ خمرہ وخنزیرہ اذا اتلفہ[۱]

مسلمان اس کی شراب اور اس کے سور کی قیمت ادا کرے گا اگر وہ اسے تلف کر دے

تحفظ عزت ذمی کو زبان یا ہاتھ پاؤں سے تکلیف پہنچانا، اس کو گالی دینا، مارنا پیٹنا، یا اس کی غیبت کرنا اسی طرح ناجائز ہے جس طرح مسلمان کے حق میں یہ افعال ناجائز ہیں۔ درالمختار میں ہے:—

ویجب کف الاذیٰ عنہ وتحرم غیبتہ کالمسلم[۲]

اس کو تکلیف دینے سے باز رہنا واجب ہے اور اس کی غیبت اسی طرح حرام ہے جیسی مسلم کی غیبت حرام ہے۔

ذمہ کی پائداری عقد ذمہ مسلمانوں کی جانب ابدی لزوم رکھتا ہے، یعنی وہ اسے باندھنے کے بعد پھر توڑ دینے کے مختار نہیں ہیں۔ لیکن دوسری جانب ذمیوں کو اختیار ہے کہ جب تک چاہیں اس پر قائم رہیں اور جب چاہیں توڑ دیں۔ بدائع میں ہے:—

واما صفۃ العقد فھو لازم فی حقنا لا یملک المسلمون نقضہ بحال من الاحوال واما فی حقھم فغیر لازم[۳]

عقد ذمہ ہمارے حق میں تو لازم ہے، یعنی ایک مرتبہ ذمی بنا لینے کے بعد ہم اس ذمہ کو کسی حال میں توڑ نہیں سکتے۔ لیکن ان کے لئے یہ لازم نہیں ہے (یعنی اگر وہ ہمارے ذمہ سے خارج ہونا چاہیں تو ہو سکتے ہیں)

ذمی خواہ کیسے ہی بڑے جرم کا ارتکاب کرے، اس کا ذمہ نہیں ٹوٹتا حتیٰ کہ جزیہ بند کر دینا، مسلمان کو قتل کرنا، نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی شان میں گستاخی کرنا، یا کسی مسلمان عورت کی آبرو ریزی کرنا بھی اس کے حق میں ناقضِ ذمہ نہیں ہے۔ ان افعال پر اسے مجرم کی حیثیت سے

---

[۱] درالمختار ج ۳ ص ۲۷۳

[۲] درالمختار جلد ۳ ص ۲۷۴ - ۲۷۳

[۳] درالمختار ج ۷ ص ۱۱۲

سزا دی جائیگی، لیکن باغی قرار دے کر ذمہ سے خارج نہیں کر دیا جائیگا۔ البتہ صرف دو صورتیں ایسی ہیں جن میں ایک ذمی خارج از ذمہ ہو جاتا ہے۔ ایک یہ کہ وہ دارالاسلام کو چھوڑ کر دشمنوں سے جا ملے۔ دوسرے یہ کہ حکومت اسلامی کے خلاف صریح بغاوت کر کے فتنہ و فساد برپا کرے[1]

شخصی معاملات Personal law

ذمیوں کے شخصی معاملات ان کی اپنی ملت کے قانون کے مطابق طے کئے جائیں گے۔ اسلامی قانون ان پر نافذ نہیں کیا جائیگا۔ ہمارے لئے شخصی معاملات میں جو کچھ ناجائز ہے، وہ اگر اُن کے مذہبی و قومی قانون میں جائز ہو تو اسلامی عدالت اُن کے قانون ہی کے مطابق فیصلہ کریگی۔ مثلاً بغیر گواہوں کے نکاح، یا بلا مہر کے نکاح، یا زمانۂ عدت کے اندر نکاح ثانی، یا محرمات کے ساتھ نکاح اگر وہ جائز رکھتے ہوں تو ان کے لئے یہ سب افعال جائز رکھے جائیں گے۔ خلفاء راشدین اور ان کے بعد کے تمام ادوار میں اسلامی حکومتوں کا اسی پر عمل رہا ہے۔ حضرت عمر ابن عبدالعزیز نے اس معاملہ میں حضرت حسن بصری سے فتویٰ طلب کیا تھا کہ:۔

مابال الخلفاء الراشدین ترکوا اھل الذمۃ وماھم علیہ من نکاح المحارم واقتناء الخمور والخنازیر؟

کیا بات ہے کہ خلفاء راشدین نے ذمیوں کو محرمات کے ساتھ نکاح اور شراب اور سور کے معاملہ میں آزاد چھوڑ دیا ہے۔

جواب میں حضرت حسن نے لکھا:۔

انما بذلوا الجزیۃ لیترکوا وما یعتقدون وانما انت متبع ولا مبتدع والسلام

انھوں نے جزیہ دینا اسی لئے تو قبول کیا ہے کہ انہیں ان کے عقیدے کے مطابق زندگی بسر کرنے کی آزادی دیجائے۔ آپ کا کام پچھلے طریقہ کی پیروی کرنا ہے نہ کہ کوئی نیا طریقہ ایجاد کرنا۔

البتہ اگر کسی مقدمہ میں فریقین خود اسلامی عدالت سے درخواست کریں کہ شریعت اسلام

[1] بدائع ج ۷ ص ۱۱۳۔ فتح القدیر ج ۴ ص ۳۸۱-۳۸۲

کے مطابق ان کا فیصلہ کیا جائے، تو عدالت ان پر اسلامی شریعت نافذ کریگی۔ نیز اگر شخصی قانون سے تعلق رکھنے والے کسی معاملہ میں ایک فریق مسلمان ہو تو بھی فیصلہ اسلامی شریعت کے مطابق ہوگا مثلاً کوئی عیسائی عورت کسی مسلمان کے نکاح میں تھی اور اس کا شوہر مرگیا، تو اس عورت کو شریعت کے مطابق پوری عدت وفات گزارنی ہوگی۔ عدت کے اندر وہ نکاح کریگی تو ایسا نکاح باطل ہوگا[1]

مذہبی مراسم | مذہبی مراسم اور قومی شعائر کو پبلک میں اعلان و اظہار کے ساتھ ادا کرنے کے متعلق اسلامی قانون یہ ہے کہ اہل الذمہ خود اپنی بستیوں میں تو ان کو پوری آزادی کے ساتھ کر سکیں گے البتہ خالص اسلامی آبادیوں[2] میں حکومت اسلامی کو اختیار ہوگا کہ ان میں آزادی دے یا ان پر کسی قسم کی پابندیاں عائد کردے۔ بدائع میں ہے:-

لا یمنعون من اظہار شئ مما ذکرنا من بیع الخمر والخنزیر والصلیب وضرب الناقوس فی قریۃ او موضع لیس من امصار المسلمین ولو کان فیہ عدد کثیر من اہل الاسلام - وانما یکرہ ذالک فی امصار المسلمین وھی التی یقام فیہا الجمع و الاعیاد والحدود .... واما اظہار فسق یعتقدون حرمتہ کالزنا و سائر الفواحش التی حرام فی دینہم فانہم یمنعون من ذلک سواء کانوا

جو بستیاں امصار مسلمین میں سے ہی نہیں ہیں ان میں ذمیوں کو شراب و خنزیر بیچنے اور صلیب نکالنے اور ناقوس بجانے سے نہیں روکا جائیگا خواہ وہاں مسلمانوں کی کتنی ہی کثیر تعداد آباد ہو۔ البتہ یہ افعال امصار مسلمین میں ناپسندیدہ ہیں یعنی ان شہروں میں جنہیں جمعہ و عیدین اور اقامت حدود کے لیے مخصوص کیا گیا ہو .... رہا وہ فسق جس کی حرمت کے خود وہ بھی قائل ہیں مثلاً زنا اور دوسرے تمام فواحش جو ان کے دین میں حرام ہیں، تو اس کے اظہار سے، ان کو ہر حال میں روکا

---

[1] المبسوط ج ۵ ص ۳۸ - ۳۹

[2] خالص اسلامی آبادیوں سے مراد وہ مقامات ہیں جو اصطلاح شرع میں "امصار المسلمین" کہلاتے ہیں۔ اس لفظ کا اطلاق صرف ان مقامات پر ہوتا ہے جن کی زمین مسلمانوں کی ملکیت ہو، اور جن کو مسلمانوں نے اظہار شعائر اسلام کیلئے مخصوص کرلیا ہو۔

فی امصار المسلمین او فی امصارهم [۱]

جائیگا خواہ وہ امصار مسلمین میں ہوں یا خود اپنے امصار میں

لیکن امصار مسلمین میں بھی ان کو صرف صلیبوں اور مورتیوں کے جلوس نکالنے اور علانیہ ناقوس بجاتے ہوئے بازاروں میں نکلنے کی ممانعت کی گئی ہے - ورنہ اپنے قدیم معابد کے اندر رہ کر وہ تمام شعائر کا اظہار کر سکتے ہیں حکومت اسلامیہ اس میں دخل نہ دیگی - [۲]

عبادت گاہیں: امصار مسلمین میں ذمیوں کے جو قدیم معابد ہوں ان سے تعرض نہیں کیا جا سکتا اگر وہ ٹوٹ جائیں تو انہیں اسی جگہ دوبارہ بنا لینے کا حق ہے - لیکن نئے معابد بنانے کا حق نہیں ہے رہے وہ مقامات جو امصار مسلمین نہیں ہیں تو ان میں ذمیوں کو نئے معابد بنانے کی بھی عام اجازت ہے - اسی طرح جو مقامات اب "مصر" نہ رہے ہوں یعنی امام نے ان کو ترک کر کے وہاں اقامت جمعہ و اعیاد اور اقامت حدود کا سلسلہ بند کر دیا ہو، ان میں بھی ذمیوں کو نئے معابد کی تعمیر اور اپنے شعائر کے اظہار کا حق حاصل ہے [۳]

ابن عباس کا فتویٰ یہ ہے :-

اما مصر مصرته العرب فلیس لهم ان یحدثوا فیه بناء بیعة ولا کنیسة ولا یضربوا فیه بناقوس ولا یظهروا فیه خمرا ولا یتخذوا فیه خنزیرًا وکل مصر کانت العجم مصرته ففتحه الله علی العرب فنزلوا علی حکمهم فللعجم ما فی عهدهم وعلی العرب ان یوفوا لهم بذالك [۵]

جن شہروں کو مسلمانوں نے آباد کیا ہے ان میں ذمیوں کو یہ حق نہیں ہے کہ نئے معابد اور کنائس تعمیر کریں یا ناقوس بجائیں یا علانیہ شراب اور سور کا گوشت بیچیں باقی رہے وہ شہر جو عجمیوں کے آباد کئے ہوئے ہیں اور جن کو اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں کے ہاتھ پر فتح کیا اور انھوں نے مسلمانوں کے حکم کی اطاعت قبول کر لی تو عجم کے لئے وہی حقوق ہیں جو ان کے معاہدہ میں

---

[۱] بدائع ج ۷ ص ۱۱۲ [۲] شرح السیر الکبیر ج ۳ ص ۲۵۱

[۳] بدائع جلد ۷ ص ۱۱۴ - شرح السیر الکبیر ج ۳ ص ۲۵۱ -

[۴] ایضاً ص ایضاً - شرح السیر الکبیر ج ۳ ص ۲۵۰ - [۵] کتاب الخراج ص ۸۸

ملے ہو جائیں اور مسلمانوں پر ان کا ادا کرنا لازم ہے۔

جزیہ وخراج کی تحصیل میں رعایات | جزیہ و خراج کے معاملہ میں ذمیوں پر تشدد کرنا ممنوع ہے۔ ان کے ساتھ نرمی اور رفق کی تاکید کی گئی ہے اور ان پر ایسا بار ڈالنے سے منع کیا گیا ہے جسے اٹھانے کی ان میں قدرت نہ ہو۔ حضرت عمرؓ نے حکم دیا تھا کہ لا یکلفوا فوق طاقتھم، جتنا مال دینا ان کی طاقت سے باہر ہو اس کے ادا کرنے کی انھیں تکلیف نہ دی جائے[1]

جزیہ کے عوض ان کی املاک کا نیلام نہیں کیا جاسکتا۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے اپنے ایک عامل کو فرمان بھیجا تھا کہ لا تبیعن لھم فی خراجھم حمارًا ولا بقرۃ ولا کسوۃ شیئًا و لا صیفًا، خراج میں ان کا گدھا، ان کی گائے، ان کے کپڑے نہ بیچنا[2]۔ ایک اور موقع پر اپنے عامل کو بھیجتے وقت حضرت علی نے فرمایا:۔

> ان کے جاڑے گرمی کے کپڑے اور ان کے کھانے کا سامان اور ان کے جانور جن سے وہ کھیتی باڑی کرتے ہیں خراج وصول کرنے کی خاطر ہرگز نہ بیچنا، نہ کسی کو درہم وصول کرنے کے لئے کوڑے مارنا، نہ کسی کو کھڑا رکھنے کی سزا دینا، نہ خراج کے عوض کسی چیز کا نیلام کرنا۔ کیونکہ ہم جو ان کے حاکم بنائے گئے ہیں تو ہمارا کام نرمی سے وصول کرنا ہے۔ اگر تم نے میرے حکم کے خلاف کیا تو اللہ میرے بجائے تم کو پکڑے گا اور اگر مجھے تمہاری خلاف ورزی کی خبر پہنچی تو میں تمہیں معزول کردوں گا[3]۔

جزیہ کی تحصیل میں ان پر ہر قسم کی سختی کرنے سے منع کیا گیا ہے۔ حضرت عمرؓ نے شام کے گورنر حضرت ابو عبیدہ رضؓ کو جو فرمان لکھا تھا اس میں منجملہ اور احکام کے ایک یہ بھی تھا کہ:۔

وامنع المسلمین من ظلمھم والاضرار | مسلمانوں کو ان پر ظلم کرنے، اور انہیں ستانے

---

[1] کتاب الخراج ص ۸ و ۸۲ [2] فتح البیان ج ۴ ص ۹۳

[3] کتاب الخراج ص ۹

بھم واکل اموالھم الا بحلھا [1] — اور ناجائز طریقہ سے ان کے مال کھانے سے منع کرو

شام کے سفر میں حضرت عمرؓ نے دیکھا کہ ان کے عامل جزیہ وصول کرنے کے لئے ذمیوں کو سزا دے رہے ہیں۔ اس پر آپ نے فرمایا کہ ان کو تکلیف نہ دو، اگر تم انھیں عذاب دو گے تو قیامت کے دن اللہ تعالیٰ تمہیں عذاب دیگا۔ لا تعذبوا الناس فان الذین یعذبون الناس فی الدنیا یعذبھم اللہ یوم القیمۃ [2]

ہشام بن حکیم نے ایک سرکاری افسر کو دیکھا کہ وہ ایک قبطی کو جزیہ وصول کرنے کے لئے دھوپ میں کھڑا کر رہا ہے۔ اس پر انھوں نے ملامت کی اور فرمایا کہ میں نے رسول اللہؐ کو یہ فرماتے سنا ہے کہ:-

ان اللہ عزوجل یعذب الذین یعذبون الناس فی الدنیا [3] — اللہ عزوجل ان لوگوں کو عذاب دیگا جو دنیا میں لوگوں کو عذاب دیتے ہیں۔

فقہاء اسلام نے نادہندوں کے حق میں صرف اتنی اجازت دی ہے کہ انھیں تادیبًا قید بے مشقت کی سزا دی جاسکتی ہے۔ امام ابو یوسف لکھتے ہیں ولکن یرفق بھم ویحبسون حتی یؤدوا ما علیھم [4]

جو ذمی محتاج اور فقیر ہو جائیں انھیں صرف جزیہ سے معاف ہی نہیں کیا جائیگا بلکہ ان کے لئے اسلامی خزانے سے وظائف بھی مقرر کئے جائیں گے۔ حضرت خالدؓ نے اہل حیرہ کو جو امان نامہ لکھ کر دیا تھا اس میں وہ لکھتے ہیں:-

وجعلت لھم ایما شیخ ضعف عن العمل — میں نے ان کے لئے یہ حق بھی رکھا ہے کہ جو

---

[1] کتاب الخراج ص ۸۲

[2] کتاب الخراج ص ۷۱

[3] ابوداؤد کتاب الخراج باب الفئ والامارہ

[4] کتاب الخراج ص ۷۰

او اصابته آفة من الآفات او كان غنيا فافتقر وصار اهل دينه يتصدقون عليه طرحت جزيته وعيل من بيت المال المسلمين هو وعياله[1]	کوئی شخص بڑھاپے کے سبب از کار رفتہ ہو جائے یا اس پر کوئی آفت نازل ہو جائے، یا وہ پہلے مالدار تھا پھر فقیر ہو گیا یہاں تک کہ اس کے ہم مذہب لوگ اس کو صدقہ و خیرات دینے لگے، تو اس کا جزیہ معاف کر دیا جائیگا اور اسے اور اس کے بال بچوں کو مسلمانوں کے بیت المال سے مدد دی جائے گی۔

ایک دفعہ حضرت عمرؓ نے ایک ضعیف العمر ذمی کو بھیک مانگتے دیکھا اور اس سے اس ذلیل حرکت کا سبب دریافت کیا۔ اس نے کہا کہ جزیہ ادا کرنے کے لئے بھیک مانگتا ہوں۔ اس پر آپ نے اس کا جزیہ معاف کر دیا اور اس کے لئے وظیفہ مقرر کیا اور اپنے افسر خزانہ کو لکھا۔

"خدا کی قسم یہ ہرگز انصاف نہیں ہے کہ ہم اس کی جوانی میں اس سے فائدہ اٹھائیں اور بڑھاپے میں اس کو رسوا کریں"[2]

دمشق کے سفر میں بھی حضرت عمرؓ نے معذور ذمیوں کے لئے امدادی وظائف مقرر کرنے کے احکام جاری کئے تھے[3]

اگر کوئی ذمی مر جائے اور اس کے حساب میں جزیہ کا بقایا واجب الادا ہو تو وہ اس کے ترکہ سے وصول نہیں کیا جائیگا اور نہ اس کے وارثوں پر اس کا بار ڈالا جائیگا۔ امام ابو یوسف لکھتے ہیں

ان وجبت عليه الجزية فمات قبل ان توخذ منه او اخذ بعضها وبقي البعض لم يوخذ بذالك ورثته ولم توخذ من تركته[4]	اگر کسی ذمی پر جزیہ واجب ہوا اور وہ اس کو ادا کرنے سے پہلے مر گیا تو اس کے ورثا سے وہ وصول نہیں کیا جائیگا اور نہ اس کے ترکہ سے لیا جائیگا۔

---

[1] کتاب الخراج ص ۸۵
[2] فتوح البلدان للبلاذری طبع یورپ ص ۱۲۹
[3] کتاب الخراج ص ۲۰۷ ۔ فتح القدیر ج ۴ ص ۳۷۳
[4] کتاب الخراج ص ۷۰ ۔ المبسوط ج ۱۰ ص ۸۱

تجارتی ٹیکس مسلمان تاجروں کی طرح ذمی تاجروں کے اموال تجارت پر بھی ٹیکس لیا جائیگا جبکہ ان کا راس المال ۲۰۰ درہم تک پہنچ جائے یا وہ ۲۰ مثقال سونے کے مالک ہو جائیں[1] اس میں شک نہیں ہے کہ فقہا نے ذمی تاجر پر تجارتی محصول ۵ فیصدی لگایا تھا اور مسلمان تاجر پر ۲½ فیصدی، لیکن یہ فعل کسی نص پر مبنی نہ تھا بلکہ اجتہاد پر مبنی تھا اور دراصل وقتی مصالح اس کے مقتضی تھے۔ اس زمانہ میں مسلمان زیادہ تر ملک کی حفاظت میں مشغول تھے اور تمام تجارت ذمیوں کے ہاتھ میں آگئی تھی۔ اسی لئے مسلمان تاجروں کی ہمت افزائی اور ان کی تجارت کے تحفظ کے لئے ان پر ٹیکس کم کر دیا گیا۔

فوجی خدمت سے استثنار ذمی فوجی خدمت سے مستثنیٰ ہیں اور دشمن سے ملک کی حفاظت کرنا تنہا مسلمانوں کے فرائض میں داخل کیا گیا ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ ایک اصول پر جو ریاست قائم ہو اس کی حفاظت کے لئے وہی لوگ لڑ سکتے ہیں اور انہی کو اس کے لئے لڑنا چاہیئے جو اس اصول کو حق مانتے ہوں۔ پھر لڑائی میں اپنے اصول اور حدود کی پابندی بھی وہی کر سکتے ہیں۔ دوسرے لوگ اگر اس ریاست کی حفاظت کے لئے لڑینگے تو محض کرایہ کے سپاہیوں (Mercenaries) کی حیثیت سے لڑیں گے اور اسلام کے مقرر کئے ہوئے اخلاقی حدود کی پابندی نہ کر سکینگے۔ اسی لئے اسلام نے ذمیوں کو فوجی خدمت سے مستثنیٰ کر کے ان پر صرف یہ فرض عائد کیا ہے کہ وہ ملکی حفاظت کے مصارف میں اپنا حصہ ادا کر دیں۔ جزیہ کی اصل حیثیت یہی ہے۔ وہ نہ صرف اطاعت کا نشان ہے، بلکہ فوجی خدمت سے استثنار کا بدل اور ملکی حفاظت کا معاوضہ بھی ہے۔ چنانچہ جزیہ صرف قابل جنگ مردوں ہی پر لگایا جاتا ہے، اور اگر مسلمان کسی وقت حفاظت سے قاصر ہوں تو جزیہ واپس کر دیا جاتا ہے[2] جنگ یرموک کے موقع پر جب

---

[1] کتاب الخراج ص ۷۰۔ مگر یہ ضروری نہیں ہے کہ آج بھی ٹیکس عائد کرنے کے لئے یہی نصاب رکھا جائے۔ یہ نصاب اس زمانہ کے حالات کے لحاظ سے تھا

[2] اس مسئلے پر مفصل بحث کے لئے ملاحظہ ہو مبسوط ج ۱۰ ص ۷۹۔۸۰، ہدایہ کتاب السیر فصل فی کیفیۃ قسمۃ الغنائم و باب الجزیہ و فتح القدیر ج ۴ ص ۲۸۔۳۲۷ و ص ۷۰۔۳۶۹ (باقی صفحہ ۳۱ پر)

رومیوں نے مسلمانوں کے مقابلہ میں ایک زبردست فوج جمع کی اور مسلمانوں کو شام کے تمام مفتوحہ علاقوں کو چھوڑ کر ایک مرکز پر اپنی طاقت سمیٹنی پڑی تو حضرت ابو عبیدہ نے اپنے امراء کو لکھا کہ جو کچھ جزیہ و خراج تم نے ذمیوں سے وصول کیا ہے انھیں واپس کردو اور ان سے کہو کہ "اب ہم تمہاری حفاظت سے قاصر ہیں اس لئے ہم نے جو مال تمہاری حفاظت کے معاوضہ میں وصول کیا تھا اسے واپس کرتے ہیں[1]" اس حکم کے مطابق تمام امراء فوج نے جمع شدہ رقوم واپس کردیں۔ بلاذری اس موقع پر غیر مسلم رعایا کے جذبات کا حال لکھتا ہے کہ جب مسلمانوں نے حمص میں جزیہ کی رقم واپس کی تو وہاں کے باشندوں نے یک زبان ہو کر کہا کہ "تمہاری حکومت اور انصاف پسندی ہم کو اُس ظلم و ستم سے زیادہ محبوب ہے جس میں ہم مبتلا تھے۔ اب ہم ہرقل کے عامل کو اپنے شہر میں ہرگز گھسنے نہ دیں گے تاوقتیکہ لڑ کر مغلوب نہ ہو جائیں۔"[2]

فقہاء اسلام کی حمایت یہ ہیں اس قانون کی تفصیلات جو صدر اوّل میں غیر مسلم رعایا کے حقوق و فرائض سے متعلق بنایا گیا تھا۔ اب آگے بڑھنے سے پہلے ہم یہ بھی بتا دینا چاہتے ہیں کہ خلفاء راشدین

(باقی حاشیہ صفحہ ۳۰) اگر کسی بیرونی حملہ کے موقع پر ملک کے غیر مسلم باشندے مدافعت کے لئے اپنی خدمات بطور خود پیش کریں تو ہم ان کی اس پیش کش کو قبول کر سکتے ہیں، لیکن اس صورت میں ان کا جزیہ ساقط کرنا ہوگا۔

یہاں یہ تصریح کر دینا بھی فائدے سے خالی نہ ہوگا کہ جزیہ کے نام سے غیر مسلموں کو جو وحشت ہوتی ہے وہ محض اس پروپیگنڈے کا نتیجہ ہے جو ایک مدت سے اسلام کے مخالفین کرتے رہے ہیں۔ ورنہ حقیقت میں اس توحش کے لئے کوئی بنیاد نہیں ہے۔ جزیہ دراصل اس تحفظ کا معاوضہ ہے جو غیر مسلموں کو اسلامی حکومت کے تحت میسر آتا ہے۔ یہ معاوضہ صرف صاحب استطاعت اور بالغ مردوں سے لیا جاتا ہے۔ اسے اگر اسلام قبول نہ کرنے کا جرمانہ قرار دیا جائے تو پھر اس زکوٰۃ کو کیا کہا جائے گا جو صاحب استطاعت مسلمان مردوں ہی سے نہیں بلکہ عورتوں سے بھی لی جاتی ہے اور جس کی شرح جزیہ کی شرح سے بہت زیادہ ہے۔ کیا وہ اسلام قبول کرنے کا جرمانہ ہے؟

(حاشیہ صفحہ ہذا) [1] کتاب الخراج ص ۱۱۱ [2] فتوح البلدان طبع یورپ ص ۱۳۷

کے بعد بادشاہی دور میں جب کبھی ذمیوں کے ساتھ بے انصافی کی گئی تو وہ فقہاء اسلام ہی کا گروہ تھا جو آگے بڑھ کر ان کی حمایت کے لئے کھڑا ہو گیا اور متفق ہو کر ان کا پشت پناہ بنا۔ تاریخ کا مشہور واقعہ ہے کہ ولید بن عبدالملک اموی نے دمشق کے کنیسۂ یوحنا کو زبردستی عیسائیوں سے چھین کر مسجد میں شامل کر لیا تھا۔ جب حضرت عمر بن عبدالعزیز تخت خلافت پر متمکن ہوئے اور عیسائیوں نے ان سے اس ظلم کی شکایت کی تو انھوں نے اپنے عامل کو لکھا کہ مسجد کا جتنا حصہ گرجا کی زمین پر تعمیر کیا گیا ہے اسے منہدم کر کے عیسائیوں کے حوالہ کر دو۔[۱]

ولید بن یزید نے رومی حملہ کے خوف سے قبرس کے ذمی باشندوں کو جلاوطن کر کے شام میں آباد کیا۔ فقہائے اسلام اور عام مسلمان اس پر سخت ناراض ہوئے اور انہوں نے اس کو گناہِ عظیم سمجھا۔ پھر جب یزید بن ولید نے انھیں دوبارہ قبرس میں لے جا کر آباد کر دیا تو اس کی عام طور پر تحسین کی گئی اور کہا گیا کہ یہی انصاف کا تقاضا ہے۔ اسمٰعیل بن عیاش کا بیان ہے کہ:۔

فاستفظع ذالک المسلمون واستعظمه الفقهاء فلمّا ولی یزید بن ولید بن عبد الملک ردهم الی قبرس فاستحسن المسلمون ذالک من فعله ورأوه عدلاً[۲]

مسلمانوں نے اس کی اس حرکت سے بیزاری ظاہر کی اور فقہاء نے اس کو گناہ سمجھا۔ پھر جب یزید بن ولید خلیفہ ہوا اور اس نے ان کو قبرس کی طرف پھر لوٹا دیا تو مسلمانوں نے اس کو پسند کیا اور اسے عدل و انصاف سمجھا۔

بلاذری کا بیان ہے کہ ایک مرتبہ جبل لبنان کے باشندوں میں سے ایک گروہ نے بغاوت کر دی۔ اس پر صالح بن علی بن عبداللہ نے ان کی سرکوبی کے لئے ایک فوج بھیجی اور اس نے ان کے ہتھیار اٹھانے والے مردوں کو قتل کر دیا اور باقی لوگوں میں سے ایک جماعت کو جلاوطن کر دیا اور ایک جماعت کو وہیں آباد رہنے دیا۔ امام اوزاعی اس زمانے میں زندہ تھے۔ انھوں نے صالح کو اس ظلم پر سخت تنبیہ کی اور

[۱] فتوح البلدان مطبوعہ یورپ ص ۱۳۲۔

[۲] فتوح البلدان ص ۱۵۶۔

ایک طویل خط لکھا جس کے چند فقرے یہ ہیں :-

"جبل لبنان کے اہل ذمہ کی جلاوطنی کا حال تم کو معلوم ہے۔ ان میں بعض ایسے لوگ بھی تھے جنھوں نے بغاوت کرنے والوں کے ساتھ کوئی حصہ نہیں لیا تھا۔ مگر باوجود اس کے تم نے کچھ کو قتل کیا اور کچھ لوگوں کو ان کی بستیوں کی طرف واپس بھیجدیا۔ میں نہیں سمجھ سکتا کہ عام لوگوں کو بعض خاص لوگوں کے جرم کی سزا کیونکر دی جا سکتی ہے اور کس بنا پر ان کے گھروں اور ان کی جائدادوں سے انہیں بے دخل کیا جا سکتا ہے، حالانکہ اللہ تعالیٰ کا حکم ہے کہ لا تزر وازرۃ وزر اخریٰ۔ اور یہ ایک واجب التعمیل حکم ہے۔ تمہارے لئے بہترین نصیحت یہ ہے کہ تم رسول اللہ کے اس ارشاد کو یاد رکھو کہ "جو کوئی کسی معاہد پر ظلم کرے گا اور اس کی طاقت سے زیادہ اس پر بار ڈالے گا اس کے خلاف میں خود مدعی ہونگا"[1]"

یہ اور ایسی ہی بے شمار مثالیں تاریخ میں ملتی ہیں جن سے معلوم ہوتا ہے کہ علماء اسلام نے ہمیشہ اہل ذمہ کے حقوق کی حمایت کی ہے اور اگر کبھی کسی امیر یا بادشاہ نے ان پر جبر و ظلم کیا بھی ہے تو جو لوگ اس کے عہد میں اسلامی قانون کے پاسبان رہے ہیں وہ کبھی اس پر ملامت کرنے سے باز نہیں رہے۔

زائد حقوق جو دئے جا سکتے ہیں یہاں تک ہم نے اہل الذمہ کے ان حقوق کا ذکر کیا ہے جو شریعت میں ان کے لئے مقرر ہیں اور جنہیں لازماً ہر اسلامی دستور میں شامل ہونا چاہیئے۔ اب ہم مختصر طور پر یہ بتائیں گے کہ موجودہ زمانہ میں ایک اسلامی ریاست اپنے غیر مسلم شہریوں کو اصول اسلام کے مطابق مزید کیا حقوق دے سکتی ہے۔

نمائندگی اور رائے دہی سب سے پہلے انتخابات کے سوال کو لیجئے۔ اسلامی حکومت چونکہ ایک اصولی حکومت ہے اس لئے وہ غیر مسلموں کے حق رائے دہی کے معاملہ میں ان فریب کاریوں سے

[1] فتوح البلدان ص ۱۶۹

کام نہیں لے سکتی جو بے دین قومی جمہوریتیں اقلیتوں کی رائے دہی کے معاملہ میں برتتی ہیں۔ اس کے رئیس حکومت کا منصب یہ ہے کہ وہ اصول اسلام کے مطابق ریاست کا نظام چلائے، اور مجلس شوریٰ کا کوئی کام اس کے سوا نہیں ہے کہ وہ اس اصولی نظام کو چلانے میں رئیس حکومت کا ہاتھ بٹائے، لہٰذا جو لوگ سرے سے اصول اسلام کو مانتے ہی نہ ہوں وہ نہ خود رئیس حکومت یا رکن شوریٰ بن سکتے ہیں اور نہ ان مناصب کے انتخاب میں رائے دہندہ کی حیثیت سے ان کا حصہ لینا کسی طرح معقول ہو سکتا ہے۔ البتہ انہیں رائے دہی اور رکنیت، دونوں چیزوں کے حقوق، بلدیات اور مقامی مجالس (Local Bodies) میں دئے جا سکتے ہیں۔ کیونکہ ان مجالس میں نظامِ زندگی زیر بحث نہیں ہوتا بلکہ صرف مقامی ضروریات کا انتظام ملحوظ خاطر ہوتا ہے۔

تہذیبی خود اختیاری اس کے ساتھ یہ بھی کیا جا سکتا ہے کہ غیر مسلم گروہوں کے لئے ایک الگ نمائندہ مجلس یا اسمبلی بنا دی جائے تاکہ وہ اپنی اجتماعی ضروریات بھی اس کے ذریعہ سے پوری کریں، اور ملکی انتظام کے معاملہ میں بھی اپنا نقطۂ نظر پیش کر سکیں۔ اس مجلس کی رکنیت اور رائے دہی غیر مسلموں کے لئے مخصوص ہو گی۔ اور اس میں ان کو پوری آزادی دی جائیگی۔ اس مجلس کے ذریعہ سے

۱۔ وہ اپنے شخصی معاملات کی حد تک قوانین تجویز کرنے اور سابق قوانین میں اصلاح و ترمیم کرنے کے مجاز ہونگے، اور اس طرح کی تمام تجاویز رئیس حکومت کی منظوری سے قانون بن سکینگی۔

۲۔ وہ حکومت کے نظم و نسق اور مجلس شوریٰ کے فیصلوں کے متعلق اپنی شکایات، اعتراضات، مشورے اور تجاویز پوری آزادی کے ساتھ پیش کر سکینگے اور حکومت انصاف کے ساتھ ان پر غور کریگی۔

۳۔ وہ اپنے گروہ کے معاملات اور عام ملکی معاملات کے متعلق سوالات بھی کر سکینگے، اور حکومت کا ایک نمائندہ ان کے جوابات دینے کے لئے موجود رہے گا۔

آزادی تحریر و تقریر وغیرہ غیر مسلموں کو اس ریاست میں تحریر و تقریر اور رائے و ضمیر اور اجتماع کی وہی آزادی حاصل ہوگی جو خود مسلمانوں کو حاصل ہو گی، اور اس معاملہ میں جو قانونی پابندیاں مسلمانوں کے ملنے ہونگی وہی ان کے لئے بھی ہونگی۔

قانون کی حدود میں رہتے ہوئے وہ حکومت پر، اس کے حکام پر اور خود رئیس حکومت پر آزادانہ تنقید کر سکینگے۔

انہیں اسلام پر بھی تنقید کا اتنا ہی حق حاصل ہوگا جتنا مسلمانوں کو ان کے مذہب پر تنقید کا حق ہوگا۔

وہ اپنے مذہب کی خوبیاں بیان کرنے میں پوری طرح آزاد ہونگے، اور اگر ایک غیر اسلامی مذہب کا پیرو کسی دوسرے غیر اسلامی مذہب کو قبول کرلے تو حکومت کو اس پر کوئی اعتراض نہ ہوگا۔ البتہ کوئی مسلمان اسلامی ریاست کے حدود میں رہتے ہوئے اپنا دین بدلنے کا مجاز نہ ہوگا۔ لیکن ارتداد کی صورت میں مواخذہ جو کچھ بھی ہوگا خود مرتد سے ہوگا نہ کہ اس غیر مسلم سے جس کا اثر قبول کرکے وہ مرتد ہوا ہے۔

انھیں اپنے ضمیر کے خلاف کوئی عقیدہ یا عمل اختیار کرنے پر مجبور نہ کیا جائیگا، اور اپنے ضمیر کے مطابق وہ ایسے سب کام کرنے کے مجاز ہونگے جو قانون ملکی سے متصادم نہ ہوتے ہوں۔

تعلیم | انہیں نظام تعلیم تو وہی قبول کرنا ہوگا جو ریاست پورے ملک کے لئے بنائیگی، لیکن جہاں تک اسلام کی مذہبی تعلیم کا تعلق ہے، اس کے پڑھنے پر وہ مجبور نہ کئے جائینگے۔ انہیں پورا حق ہوگا کہ ملکی درسگاہوں میں، یا خود اپنی مخصوص درسگاہوں میں، اپنے مذہب کی تعلیم کا مستقل انتظام کریں۔

ملازمتیں | چند مخصوص مناصب کے سوا وہ تمام ملازمتوں میں داخل ہونے کے حقدار ہوں گے اور اس معاملہ میں ان کے ساتھ کوئی تعصب نہ برتا جائیگا۔ مسلمان اور غیر مسلم، دونوں کے لئے اہلیت کا ایک ہی معیار ہوگا اور اہل آدمیوں کو بلا امتیاز انتخاب کیا جائیگا۔

مخصوص مناصب سے مراد ایسے مناصب ہیں جو اسلام کے اصولی نظام میں کلیدی حیثیت رکھتے ہوں۔ ان مناصب کی فہرست کافی غور و خوض کے بعد ماہرین کی ایک جماعت بنا سکتی ہے۔ ہم ایک قاعدۂ کلیہ کے طور پر صرف یہ کہہ سکتے ہیں کہ جن خدمات کا تعلق پالیسیوں کی تشکیل اور محکموں کی رہنمائی سے ہے وہ سب کلیدی اہمیت رکھنے والی خدمات ہیں، اور ایک اصولی نظام میں ایسی خدمات صرف انہی لوگوں کو دی جا سکتی ہیں جو اس کے اصولوں پر اعتقاد رکھتے ہوں۔ ان خدمات کو مستثنیٰ

کرنے کے بعد باقی تمام نظم و نسق میں بڑے سے بڑے عہدوں پر بھی اہل الذمہ اپنی اہلیت کے لحاظ سے مقرر کئے جا سکتے ہیں۔ مثلاً کوئی چیز ان میں سے کسی شخص کے اکاؤنٹنٹ جنرل، یا چیف انجنیر، یا پوسٹ ماسٹر جنرل بنائے جانے میں مانع نہیں ہے۔

اسی طرح فوج میں بھی، صرف جنگی خدمات محفوظ ملازمتوں میں شمار ہونگی۔ باقی دوسرے فوجی شعبے جن کا تعلق براہ راست حرب و ضرب سے نہیں ہے، ذمیوں کے لئے کھلے ہونگے۔

معاشی کاروبار اور پیشے

صنعت و حرفت، تجارت، زراعت اور دوسرے تمام پیشوں کے دروازے غیر مسلموں کے لئے بالکل کھلے رہیں گے۔ ان میں نہ مسلمانوں کو ایسی کوئی رعایت حاصل ہوگی جو غیر مسلموں کو نہ حاصل ہو، اور نہ غیر مسلموں پر کوئی ایسی پابندی عائد کی جا سکے گی جو مسلمانوں کے لئے نہ ہو۔ ہر شہری کو خواہ وہ مسلم ہو یا غیر مسلم، معاشی میدان میں جدوجہد کا مساویانہ حق ہوگا۔

غیر مسلموں کے لئے تحفظ کی واحد صورت

آخر میں اس امر کی توضیح بھی ضروری ہے کہ ایک اسلامی حکومت اپنے غیر مسلم شہریوں کو جو حقوق بھی دیگی بلا اس لحاظ کے دیگی کہ کوئی ہمسایہ غیر مسلم حکومت اپنی مسلمان رعایا کو کیا حقوق دیتی ہے، بلکہ کچھ دیتی بھی ہے یا نہیں۔ ہم اس بات کے قائل نہیں ہیں کہ مسلمان کافروں کو دیکھ دیکھ کر اپنا لائحہ عمل بنائے، وہ انصاف کریں تو یہ بھی کرے، اور وہ ظلم کرنے لگیں تو یہ بھی ظلم پر اتر آئے۔ ہم مسلمان ہونے کی حیثیت سے ایک قطعی اور واضح اصول کے پیرو ہیں اور ہمیں بہرحال اپنے حدود اختیار میں اپنے اصولوں پر ہی عمل کرنا ہے۔ جو ہم دیں گے نیک نیتی کے ساتھ دینگے، صرف کاغذ ہی پر نہیں بلکہ زمین پر بھی دینگے، اور اپنی لی ہوئی ذمہ داریوں کو انصاف اور سچائی کے ساتھ ادا کرینگے۔

اس کے بعد یہ بیان کرنے کی حاجت نہیں رہتی کہ پاکستان میں غیر مسلموں کے لئے تحفظ، امن اور خوشحالی کی اس سے بڑھ کر، بلکہ درحقیقت اس کے سوا کوئی قابل اعتماد ضمانت نہیں ہو سکتی کہ یہاں ایک خالص اسلامی حکومت قائم ہو جائے۔ صرف اسی صورت میں ظلم اور جوابی ظلم کا وہ شیطانی چکر ٹوٹ سکتا ہے جو بدقسمتی سے ہندوستان میں چل رہا ہے۔ صرف اسی صورت میں

پاکستان بھی انصاف کا گھر بن سکتا ہے اور انڈین یونین کو بھی انصاف کا راستہ نظر آسکتا ہے۔ افسوس ہے کہ غیر مسلم ایک مدت سے اسلام کی غلط تعبیریں سنتے اور دیکھتے چلے آرہے ہیں، اس لئے وہ اسلامی حکومت کا نام سن کر گھبراتے ہیں، اور ان میں سے بعض لوگ یہ شور مچانے لگتے ہیں کہ یہاں بھی انڈین یونین کی طرح بے دین جمہوریت قائم ہونی چاہیئے۔ مگر ہم کو تعجب ہے کہ وہ خود ہی اصرار کر کے یہاں اس چیز کا تجربہ کرنا چاہتے ہیں جس کا مزہ آج انڈین یونین کے مسلمان چکھ رہے ہیں۔ کیا واقعی وہ کوئی خوشگوار حالت ہے جس کی تمنا کی جا سکتی ہو؟ کیا اس کے بجائے ایک ایسے نظام کا تجربہ کرنا زیادہ بہتر نہ ہوگا جس کی بنیاد خدا ترسی اور دیانت اور مستقل اصولوں کی پیروی پر ہو؟

ہماری نئی زیر طبع مطبوعات

۱- **سود** - اس کتاب میں مدیر ترجمان نے سود، بینکنگ، انشورنس وغیرہ کی حقیقت و ماہیت پر بحث کی ہے اور ان سے متعلقہ معاشی نظریات اور مسائل پر اسلامی نقطۂ نظر سے تنقید کی ہے۔
ضخامت ۲۰۰ صفحات، قیمت ۳/

۲- **الجہاد فی الاسلام** - یہ کتاب عرصے سے نایاب اور غیر مطبوع تھی۔ اب اسے دوبارہ چھپوایا جا رہا ہے۔

۳- **منہاج الانقلاب الاسلامی** "یہ اسلامی حکومت کس طرح قائم ہوتی ہے" کا عربی ترجمہ ہے جو مولانا مسعود عالم ندوی نے کیا ہے۔ ضخامت ۴۵ صفحات، قیمت ۸/

۴- **الدین القیم** - یہ دین حق کا عربی ترجمہ ہے جو مترجم موصوف نے ہی کیا ہے۔ ضخامت ۴۵ صفحات قیمت ۸/

۵- **نظریۃ الاسلام السیاسیہ** - اسلام کے نظریہ سیاسی کا عربی ترجمہ جو چھپ چکا ہے۔ ضخامت ۴۵ صفحات قیمت ۸/

۶- **تفہیمات** - بھی دوبارہ طبع ہو چکی ہے۔ قیمت ۳/

مکتبہ جماعت اسلامی، اچھرہ، لاہور

اسلامی قانون

(۲)

پاکستان میں اس کا نفاذ کس طرح ہو سکتا ہے

یہ تقریر ۱۹ فروری ۱۹۴۸ء کو لا کالج لاہور میں کی گئی تھی

اس سے پہلے میں آپ کے سامنے ایک تقریر اس موضوع پر کر چکا ہوں کہ اسلامی قانون کی حقیقت کیا ہے، اس کی روح اور اس کا مقصد کیا ہے، اس کے بنیادی اصول کیا ہیں، مسلمان ہونے کی حیثیت سے ہمارا اس کے ساتھ تعلق کیا ہے اور ہم کیوں اپنے ملک میں اسے نافذ کرنے کے پابند ہیں، اور وہ شبہات کیا وزن رکھتے ہیں جو اس کے بارے میں عام طور پر پیش کئے جاتے ہیں۔ میری وہ تقریر محض ایک تعارفی تقریر تھی۔ اب میں ذرا تفصیل کے ساتھ اس مسئلے پر بحث کرنا چاہتا ہوں کہ اگر اب ہم اس ملک میں اسلامی قانون کو از سر نو جاری کرنا چاہتے ہیں تو ہمیں اس کے لئے کیا تدبیر یں کرنی ہونگی۔

فوری انقلاب نہ ممکن ہے نہ مطلوب اس سلسلہ میں سب سے پہلے میں ضروری سمجھتا ہوں کہ اس غلط فہمی کو دور کردوں جو اسلامی قانون کے اجراء کے متعلق کثرت سے لوگوں کے ذہن میں پائی جاتی ہے۔ لوگ جب سنتے ہیں کہ ہم یہاں اسلامی حکومت قائم کرنا چاہتے ہیں اور اس حکومت میں ملک کا قانون اسلامی قانون ہوگا تو انہیں یہ گمان ہوتا ہے کہ شاید نظامِ حکومت کے تغیر کا اعلان ہوتے ہی تمام پچھلے قوانین یک لخت منسوخ ہو جائینگے اور اسلامی قانون بیک وقت نافذ کردیا جائیگا۔ یہ غلط فہمی صرف عام لوگوں ہی میں نہیں پائی جاتی بلکہ اچھے خاصے مذہبی طبقے

بھی اس میں مبتلا ہیں۔ ان کے نزدیک ایسا ہونا ہی چاہیے کہ ادھر اسلامی حکومت قائم ہو اور ادھر فوراً ہی غیر اسلامی قوانین کا نفاذ بند اور اسلامی قانون کا نفاذ شروع ہو جائے۔ درحقیقت یہ لوگ اس بات کو بالکل نہیں سمجھتے کہ ایک ملک کا قانون اس کے اخلاقی، معاشرتی، معاشی اور سیاسی نظام کے ساتھ گہرا تعلق رکھتا ہے۔ انہیں معلوم نہیں ہے کہ جب تک کسی ملک کا نظامِ زندگی اپنے سارے شعبوں کے ساتھ نہ بدلے اُس کے قانونی نظام کا بدل جانا ممکن نہیں ہے۔ انہیں اس کا بھی اندازہ نہیں ہے کہ پچھلے سو ڈیڑھ سو برس سے ہم پر جو (انگریزی) اقتدار مسلط رہا ہے اس نے کس طرح ہماری زندگی کے پورے نظام کو اسلامی اصولوں سے ہٹا کر غیر اسلامی اصولوں پر چلا دیا ہے۔ اور اب اسے پھر بدل کر دوسری بنیادوں پر قائم کرنا کتنی محنت، کتنی کوشش اور کتنا وقت چاہتا ہے۔ یہ لوگ عملی مسائل میں بصیرت نہیں رکھتے، اس لئے اجتماعی نظام کی تبدیلی کو ایک کھیل سمجھتے ہیں اور ہتھیلی پر سرسوں جمانے کا خواب دیکھتے ہیں۔ پھر ان کی یہی باتیں اُن لوگوں کو جو اسلامی نظام سے فرار کی راہیں ڈھونڈ رہے ہیں، یہ موقع دے دیتی ہیں کہ وہ اس تخیل کا مذاق اڑائیں اور اس کے حامیوں کا استخفاف کریں۔

تدریج کا اصول | اگر ہم فی الواقع اپنے اس تخیل کو کامیاب دیکھنا چاہتے ہیں تو ہمیں فطرت کے اس اٹل قاعدے سے غافل نہ ہونا چاہیے کہ اجتماعی زندگی میں جتنے تغیرات بھی ہوتے ہیں تدریج ہی سے ہوا کرتے ہیں۔ انقلاب جتنا اچانک اور جس قدر یک رخا ہوگا اتنا ہی وہ ناپائدار ہوگا۔ ایک مستحکم اور پائندہ انقلاب کے لئے یہ بالکل ضروری ہے کہ وہ زندگی کی ہر جہت اور ہر پہلو میں پورے توازن کے ساتھ کارفرما ہو تاکہ اس کا ہر گوشہ دوسرے گوشے کو سہارا دے سکے۔

عہدِ نبوی کی مثال | اس کی بہترین مثال خود وہ انقلاب ہے جو نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے عرب میں برپا کیا تھا۔ جو شخص حضورؐ کے کام سے تھوڑی سی واقفیت رکھتا ہے اسے بھی معلوم ہے کہ آپؐ نے پورا اسلامی قانون اپنے سارے شعبوں کے ساتھ بیک وقت نافذ نہیں کر دیا تھا۔ بلکہ معاشرے کو بتدریج اس کے لیے تیار کیا تھا اور اس تیاری کے ساتھ آہستہ آہستہ سابق جاہلیت

کے طریقوں اور قاعدوں کو بدل کر نئے اسلامی طریقے اور قاعدے جاری کئے تھے۔ آپ نے سب سے پہلے اسلام کے بنیادی تصورات اور اخلاقی اصول لوگوں کے سامنے پیش کئے۔ پھر جو لوگ اس دعوت کو قبول کرتے گئے انہیں آپ تربیت دے کر ایک ایسا صالح گروہ تیار کرتے چلے گئے جس کا ذہن اور زاویۂ نظر اور طرزِ عمل خالص اسلامی تھا۔ جب یہ کام ایک خاص حد تک پایۂ تکمیل کو پہنچ گیا تو آپ نے دوسرا قدم اٹھایا، اور وہ یہ تھا کہ مدینے میں ایک ایسی حکومت قائم کردی جو خالص اسلامی نظریہ پر مبنی تھی اور جس کا مقصد ہی یہ تھا کہ ملک کی زندگی کو اسلام کے نقشے پر ڈھال دے۔ اس طرح سیاسی طاقت اور ملکی ذرائع کو ہاتھ میں لے کر نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے وسیع پیمانے پر اصلاح و تعمیر کا وہ کام شروع کیا جس کے لئے آپ پہلے صرف دعوت و تبلیغ کے ذریعہ سے کوشش فرمارہے تھے۔ آپ نے ایک مرتب اور منظم طریقے سے لوگوں کے اخلاق، معاشرت، تمدن اور معیشت کو بدلنے کی جدوجہد کی۔ تعلیم کا ایک نیا نظام قائم کیا، جو اس زمانے کے حالات کے لحاظ سے زیادہ تر زبانی تلقین کے طریقے پر تھا۔ جاہلیت کے خیالات کی جگہ اسلامی طرزِ فکر کی اشاعت کی۔ پرانی رسموں اور طور طریقوں کی جگہ نئے اصلاح یافتہ رواج اور آداب و اطوار جاری کئے۔ اور اس ہمہ گیر اصلاح کے ذریعے سے جوں جوں زندگی کے مختلف گوشوں میں انقلاب رونما ہوتا گیا، آپ اسی کے مطابق پورے توازن اور تناسب کے ساتھ اسلامی قانون کے احکام جاری کرتے چلے گئے، یہاں تک کہ ۹ سال کے اندر ایک طرف اسلامی زندگی کی تعمیر مکمل ہوئی اور دوسری طرف پورا اسلامی قانون ملک میں نافذ ہوگیا۔

قرآن اور حدیث کے غائر مطالعے سے ہمیں واضح طور پر یہ معلوم ہوجاتا ہے کہ آپ نے یہ کام کس ترتیب و تدریج کے ساتھ کیا تھا۔ وراثت کا قانون ۳ھ ہجری میں جاری کیا گیا۔ نکاح و طلاق کے قوانین رفتہ رفتہ ۷ھ ہجری میں جاکر مکمل ہوئے۔ فوجداری قوانین کئی سال تک ایک ایک دفعہ کرکے نافذ کئے جاتے رہے یہاں تک کہ ۸ھ میں ان کی تکمیل ہوئی۔ شراب کی بندش کے لئے بتدریج فضا

تیار کی گئی اور سنہ ہجری میں اس کا قطعی انسداد کر دیا گیا۔ سود کی برائی اگرچہ مکہ ہی میں صاف صاف بیان کی جا چکی تھی، مگر اسلامی حکومت قائم ہوتے ہی اسے یک لخت بند نہیں کر دیا گیا بلکہ ملک کے پورے معاشی نظام کو بدل کر جب نئے سانچوں میں ڈھال لیا گیا تب کہیں سنہ ۹ ہجری میں سود کی قطعی حرمت کا قانون جاری کیا گیا۔ یہ کام بالکل ایک معمار کا سا کام تھا جس نے اپنے پیش نظر نقشے کی عمارت بنانے کے لئے کاریگر اور مزدور جمع کئے، ذرائع و وسائل مہیا کئے، زمین ہموار کی، بنیادیں کھودیں، پھر ایک ایک اینٹ رکھ کر ہر جہت سے عمارت کو اٹھاتا ہوا اوپر تک لے گیا، اور چند سال کی مسلسل محنت کے بعد آخر کار وہ عمارت مکمل کر دی جس کا خاکہ اس کے ذہن میں تھا۔

انگریزی دور کی مثال | تو بہت کے زمانہ میں خود ہمارے ملک پر جب انگریزوں کی حکومت قائم ہوئی تھی تو کیا انہوں نے یک لخت یہاں کا سارا نظام بدل ڈالا تھا؟ نہیں۔ ان کی حکومت سے پہلے چھ سات سو برس سے یہاں کا پورا نظام زندگی اسلامی فقہ پر چل رہا تھا۔ اس صدیوں کی جمی ہوئی عمارت کو ڈھا دینا اور مغربی اصول و نظریات کے مطابق ایک دوسرے نظام کی عمارت کھڑی کر دینا ایک دن کا کام نہ تھا۔ تاریخ سے ہمیں معلوم ہوتا ہے کہ انگریزی اقتدار قائم ہونے کے بعد بھی ایک مدت تک ہندوستان میں اسلامی فقہ ہی رائج تھا۔ عدالتوں میں قاضی ہی انصاف کے لئے بیٹھتے تھے اور اسلام کا قانون صرف پرسنل لا کی حد تک محدود نہ تھا بلکہ وہی ملکی قانون (Law of the Land) بھی تھا۔ انگریزوں کو یہاں کا قانونی نظام بدلتے بدلتے ایک صدی لگ گئی۔ انہوں نے بتدریج یہاں کا نظام تعلیم بدل کر اپنے مطلب کے آدمی ڈھالے، اپنے خیالات کی اشاعت سے ذہنیتیں بدلیں، اپنے اقتدار کے اثر سے لوگوں کے اخلاق بدلے، اپنی بالادستی کے زور سے معاشی نظام بدلا، اور پھر جیسے جیسے یہ مختلف قسم کے ہمہ گیر اثرات یہاں کی اجتماعی زندگی کو بدلتے گئے اسی کے مطابق پرانے قوانین منسوخ اور نئے قوانین جاری ہوتے چلے گئے۔

تدریج ناگزیر ہے | اب اگر ہم یہاں پھر اسلامی قانون جاری کرنا چاہتے ہیں تو ہمارے لئے بھی انگریزی حکومت کے صد سالہ نقوش کو کھرچ دینا اور نئے نقوش ثبت کر دینا محض ایک جنبش قلم سے

ممکن نہیں ہے۔ ہمارا پرانا نظام تعلیم زندگی اور اس کے عملی مسائل سے ایک مدت دراز تک بے تعلق رہنے کے باعث اس قدر بے جان ہو چکا ہے کہ اس کے فارغ التحصیل لوگوں میں ایک فی ہزار کے اوسط سے بھی ایسے آدمی نہیں نکل سکتے جو ایک جدید ترقی یافتہ ریاست کے جج اور مجسٹریٹ بنائے جا سکیں۔ دوسری طرف موجودہ نظام تعلیم نے جو آدمی تیار کیے ہیں وہ اسلام اور اس کے قوانین سے بالکل بے بہرہ ہیں اور ان میں ایسے افراد بھی خال خال ہی پائے جاتے ہیں جن کی ذہنیت ہی کم از کم اس تعلیم کے زہریلے اثرات سے محفوظ رہ گئی ہو۔ پھر سو ڈیڑھ سو برس تک معطل رہنے کی وجہ سے ہمارا قانونی ذخیرہ بھی زمانے کی رفتار سے اچھا خاصا پیچھے رہ گیا ہے اور اسے موجودہ دور کی عدالتی ضروریات کے لئے کارآمد بنانا کافی محنت چاہتا ہے۔ اور سب سے بڑی بات یہ ہے کہ ایک طویل مدت تک اسلامی اثر سے آزاد اور انگریزی حکومت کے تابع رہتے رہتے ہمارے اخلاق، تمدن، معاشرت، معیشت اور سیاست کا نقشہ اصل اسلامی نقشے سے بہت مختلف ہو چکا ہے۔ اس حالت میں ملک کے قانونی نظام کو یک بخت بدل دینا ـــــ اگر ایسا کرنا ممکن بھی ہو ـــــ نتیجہ خیز نہیں ہو سکتا، کیونکہ اس صورت میں زندگی کا نظام اور قانونی نظام دونوں ایک دوسرے سے بیگانہ، بلکہ باہم متصادم ہوں گے، اور ایسے قانونی تغیر کا وہی حشر ہو گا جو ایک پودے کو ایسی آب و ہوا اور ایسی زمین میں لگا دینے سے ہوا کرتا ہے جو اس کے مزاج سے کوئی مناسبت نہ رکھتی ہو۔ لہٰذا یہ بالکل ناگزیر ہے کہ جس اصلاح و تغیر کے ہم طالب ہیں وہ تدریج کے ساتھ ہو، اور قانونی تبدیلیاں اخلاق، تعلیم، معاشرت، تمدن، معیشت اور سیاست کی تبدیلیوں کے ساتھ متوازن طریقہ سے کی جائیں۔

ایک غلط بہانہ لیکن تدریج کے اس معقول اور بجائے خود بالکل صحیح اصول کو بہانہ بنا کر جو لوگ اس بات کے حق میں استدلال کرنے کی کوشش کرتے ہیں کہ سردست تو یہاں ایک غیر دینی ـــــ بلکہ زیادہ صحیح الفاظ میں ایک بے دین ـــــ ریاست ہی قائم ہونی چاہیئے، پھر جب اسلامی ماحول تیار ہو جائیگا تو وہ اسلامی ریاست بھی قائم ہو جائیگی جو اسلامی قانون جاری کر سکے، وہ سراسر ایک نامعقول بات

کہتے ہیں ۔ میں ان سے پوچھتا ہوں کہ یہ ماحول تیار کون کریگا ؟ کیا ایک بے دین ریاست جس کی باگیں فرنگیت زدہ حکام اور لیڈروں کے ہاتھ میں ہوں ؟ کیا وہ معمار جو صرف میخانہ و صنم خانہ ہی کی تعمیر جانتے اور اسی سے دلچسپی بھی رکھتے ہیں، ایک مسجد تعمیر کرنے کا سامان کرینگے ؟ اگر ان لوگوں کا یہی مطلب ہے تو انسانی تاریخ میں یہ پہلا اور بالکل نرالا تجربہ ہوگا کہ بے دینی خود دین کو پروان چڑھا کر اپنی جگہ لینے کے لئے تیار کریگی ! اور اگر ان کا مطلب کچھ اور ہے تو وہ ذرا اس کی صاف صاف توضیح فرمائیں کہ اسلامی ماحول کی تیاری کا کام کون، کس طاقت اور کن ذرایع سے کریگا اور اس دوران میں بے دین ریاست اپنے ذرایع اور اقتدار کو کس چیز کی تعمیر و ترقی میں صرف کرتی رہیگی ؟

ابھی ابھی تدریج کا اصول ثابت کرنے کے لئے جو مثالیں میں نے پیش کی ہیں انہیں اگر آپ ایک مرتبہ پھر اپنے ذہن میں تازہ کرلیں تو آپ یہ بات اچھی طرح سمجھ سکتے ہیں کہ اسلامی نظام زندگی کی تعمیر ہو یا غیر اسلامی نظام زندگی کی، اگرچہ وہ ہوتی تو تدریج ہی سے ہے، لیکن تدریجاً اس کی تعمیر صرف اسی صورت میں ہو سکتی ہے جبکہ ایک معمار طاقت اپنے سامنے ایک مقصد اور ایک نقشہ رکھ کر مسلسل اس کے لئے کام کرے ۔ صدر اول میں جو اسلامی انقلاب ہوا تھا، اسی طرح تو ہوا تھا کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے برسوں اس کے لئے سعی کی، موزوں آدمی تیار کئے، تعلیم و تبلیغ کے ذریعہ سے لوگوں کے خیالات بدلے، حکومت کے پورے نظم و نسق کو معاشرے کی اصلاح اور ایک نئے تمدن کی تخلیق کے لئے استعمال کیا، اور اس طرح وہ ماحول بنا جس میں اسلامی قانون جاری ہو سکا ۔ ماضی قریب میں انگریزوں نے ہندوستان کے نظام زندگی میں جو تغیرات کئے وہ بھی تو اسی طرح ہوئے کہ زمام کار ایسے لوگوں کے ہاتھ میں تھی جو اس تغیر کے خواہشمند تھے اور اس کے لئے کام کرنا جانتے تھے ۔ انھوں نے ایک مقصد اور ایک نقشے کو نگاہ میں رکھ کر پیہم اس تغیر کے لئے کوشش کی اور آخر کار یہاں کے پورے نظام زندگی کو اس سانچے میں ڈھال کر ہی چھوڑا جو اُن کے اصول و قوانین سے مناسبت رکھتا تھا ۔ پھر کیا اب ہماری پیش نظر تعمیر اس معمار طاقت کے بغیر ہو جائیگی، یا ایسے معماروں کے ہاتھوں ہو سکے گی جو اس نقشے پر تعمیر کا کام نہ جانتے ہوں اور نہ چاہتے ہوں ؟

صحیح ترتیب کار | میں سمجھتا ہوں، اور مجھے اُمید ہے کہ ہر معقول آدمی اس معاملہ میں مجھ سے اتفاق کریگا کہ جب یہ پاکستان اسلام کے نام سے اور اسلام کے لئے مانگا گیا ہے اور اسی بنا پر ہماری یہ مستقل ریاست قائم ہوئی ہے تو ہماری اس ریاست ہی کو وہ معمار طاقت بننا چاہیئے جو اسلامی زندگی کو تعمیر کرے اور جبکہ یہ ریاست ہماری اپنی ریاست ہے اور ہم اپنے تمام قومی ذرائع و وسائل اس کے سپرد کر رہے ہیں، تو کوئی وجہ نہیں کہ ہم اس تعمیر کے لئے کہیں اور سے معمار فراہم کریں۔

یہ بات اگر صحیح ہے تو پھر اس تعمیر کی راہ میں پہلا قدم یہ ہونا چاہیئے کہ ہم اپنی اس ریاست کو، جو ابھی تک انگریز کی چھوڑی ہوئی کافرانہ بنیادوں پر قائم ہے، مسلمان بنائیں۔ اور اسے مسلمان بنانے کی آئینی صورت یہ ہے کہ ہماری دستور ساز اسمبلی باقاعدہ اس امر کا اعلان کرے کہ

۱۔ پاکستان میں حاکمیت خدا کی ہے اور ریاست اس کے نائب کی حیثیت سے ملک کا انتظام کریگی۔

۲ ریاست کا اساسی قانون شریعت خداوندی ہے جو محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے ذریعہ سے ہمیں پہنچی ہے

۳۔ تمام پچھلے قوانین جو شریعت سے متصادم ہوتے ہیں بتدریج بدل دیئے جائیں گے اور آئندہ کوئی ایسا قانون نہ بنایا جا سکے گا جو شریعت سے متصادم ہوتا ہو۔

۴۔ ریاست اپنے اختیارات کے استعمال میں اسلامی حدود سے تجاوز کرنے کی مجاز نہ ہوگی۔

یہ وہ کلمۂ شہادت ہے جسے اپنی آئینی زبان ـــــ یعنی دستور ساز اسمبلی ـــــ کے ذریعہ سے ادا کر کے ہماری ریاست "مسلمان" ہو جائیگی۔

اس اعلان کے بعد ہی صحیح طور پر ہمارے رائے دہندوں کو یہ معلوم ہوگا کہ اب انہیں کس مقصد اور کس کام کے لئے اپنے نمائندے منتخب کرنے ہیں۔ عوام میں علم و دانش کی لاکھ کمی سہی، مگر وہ اتنی سمجھ بوجھ ضرور رکھتے ہیں کہ انہیں کس کام کے لئے کس کی طرف رجوع کرنا چاہیئے اور ان کے درمیان کون لوگ کس مطلب کے لئے موزوں ہیں۔ آخر وہ اتنے نادان تو نہیں ہیں کہ علاج کے لئے وکیل اور مقدمہ لڑنے کے لئے ڈاکٹر کو تلاش کریں۔ وہ اس کو بھی کسی نہ کسی حد تک جانتے ہی ہیں کہ ان کی

بستیوں میں ایماندار اور خدا ترس لوگ کون ہیں، چالاک اور دنیا پرست کون، اور شریر و مفسد کون۔ جیسا مقصد ان کے سامنے ہوتا ہے ویسے ہی آدمی وہ اس کے لئے اپنے اندر سے ڈھونڈ نکالتے ہیں۔ اب تک ان کے سامنے یہ مقصد آیا ہی نہ تھا کہ انہیں ایک دینی نظام چلانے کے لئے آدمی درکار ہیں۔ پھر وہ اس کے چلانے والے آخر تلاش کرتے تو کیوں۔ جیسا بے دین اور غیر اخلاقی نظام ملک میں قائم تھا اور اس کا مزاج جس قسم کے آدمی چاہتا تھا، اس کے لئے ویسے ہی آدمیوں پر لوگوں کی نگاہ انتخاب پڑی اور انہی کو انہوں نے چن کر بھیجدیا۔ اب اگر ہم ایک اسلامی ریاست کا دستور بنائیں اور لوگوں کے سامنے سوال یہ آجائے کہ اس نظام کو چلانے کے لئے انہیں موزوں آدمی منتخب کرنے ہیں، تو چاہے ان کا انتخاب کمال درجہ کا معیاری نہ ہو، مگر بہر حال اس کام کے لئے ان کی نگاہیں فساق و فجار اور دین مغربی کے مومنین پر نہیں پڑینگی۔ وہ اس کے لئے انہی لوگوں کو تلاش کریں گے جو اخلاقی، ذہنی اور علمی حیثیت سے اس کے اہل ہونگے۔

پس ریاست کو مسلمان بنانے کے بعد تعمیر حیات اسلامی کی راہ میں دوسرا قدم یہ ہے کہ جمہوری انتخاب کے ذریعہ سے اس ریاست کی زمام کار ایسے لوگوں کے ہاتھ میں منتقل ہو جو اسلام کو جانتے بھی ہوں اور اس کے مطابق ملک کے نظام زندگی کو ڈھالنا چاہتے بھی ہوں۔

اس کے بعد تیسرا قدم یہ ہے کہ اجتماعی زندگی کے مختلف پہلوؤں کی ہمہ گیر اصلاح کا ایک منصوبہ (Plan) بنایا جائے اور اسے عمل میں لانے کے لئے ریاست کے تمام ذرائع و وسائل استعمال کئے جائیں۔ تعلیم کا نظام بدلا جائے۔ ریڈیو، پریس، سنیما اور خطابت کی ساری طاقتیں لوگوں کے خیالات کی اصلاح اور ایک نئی اسلامی ذہنیت کی تخلیق میں صرف کی جائیں۔ معاشرت اور تمدن کو نئے سانچوں میں ڈھالنے کے لئے پیہم اور باقاعدہ کوشش کی جائے۔ سول سروس، پولیس، جیل، عدالت اور فوج سے بتدریج ان عناصر کو خارج کیا جائے جو پرانے فاسقانہ و کافرانہ نظام کی عادات و خصائل میں ڈھل کر سوکھ چکے ہیں، اور ان نئے عناصر کو کام کرنے کا موقع دیا جائے جو اس اصلاح کے کام میں مددگار بن سکتے ہیں۔ معاشی نظام میں بنیادی تبدیلیاں کی جائیں اور اس کا

پورا ڈھانچہ، جو پرانی ہندوانہ اور جدید فرنگیانہ بنیادوں پر چل رہا ہے، ادھیڑ ڈالا جائے۔ میں یقین رکھتا ہوں کہ اگر ایک صالح اور مدبر گروہ اقتدار کے منصب پر فائز ہو اور ملک کے سارے وسائل اور حکومت کے پورے نظم ونسق کی طاقت سے کام لے کر باقاعدگی کے ساتھ اصلاح کے ایک سوچے سمجھے منصوبے پر عمل شروع کردے تو دس سال کے اندر اس ملک کی اجتماعی زندگی کا نقشہ بالکل بدل ڈالا جاسکتا ہے، اور جیسے جیسے یہ تبدیلی واقع ہوتی جائے، ایک صحیح توازن کے ساتھ سابق قوانین کی ترمیم وتنسیخ اور اسلامی قوانین کے نفاذ کا سلسلہ جاری ہو سکتا ہے، یہاں تک کہ بالآخر جاہلیت کا کوئی قانون ہمارے ملک میں باقی نہ رہے اور اسلام کا کوئی حکم نافذ ہونے سے نہ رہ جائے۔

اجراء قانونِ اسلامی کے لئے تعمیری کام اب میں خاص طور پر اس تعمیری کام کی کچھ تفصیل آپ سے بیان کرونگا جو ملک کے قانونی نظام کو بدلنے اور اسلام کے قوانین کو جاری کرنے کے لئے ہمیں کرنا ہوگا۔ جس اصلاحی پروگرام کی طرف ابھی میں اشارہ کرچکا ہوں اس کے سلسلہ میں ہم کو قریب قریب ہر شعبۂ زندگی میں بہت سے تعمیری کام کرنے پڑینگے، کیونکہ مدتہائے دراز کے تعطل، انحطاط اور غلامی نے ہمارے تمدن کی عمارت کے ہر گوشے کو خراب کرکے چھوڑا ہے۔ لیکن اس وقت میری تقریر ایک خاص موضوع سے تعلق رکھتی ہے اس لئے دوسرے گوشوں کے تعمیری کام سے قطع نظر کرکے یہاں میں صرف اس کام کے متعلق کچھ عرض کرونگا جو ہمیں قانون اور نظم عدالت کے سلسلہ میں کرنا ہے۔

ایک قانونی اکیڈمی کا قیام اس پہلو میں اولین کام جو ہمیں کرنا چاہئیے، یہ ہے کہ ایک قانونی اکیڈمی قائم کی جائے جو اس پورے کام کا جائزہ لے جو علم قانون میں ہمارے اسلاف اس سے پہلے کرچکے ہیں، اور اُن ضروری کتابوں کو جو فقہ اسلامی کی واقفیت کے لئے ناگزیر ہیں، اُردو زبان میں صرف منتقل ہی نہ کرے بلکہ ان کے مواد کو زمانۂ حال کے طرزِ ترتیب کے مطابق مرتب بھی کردے تاکہ ان سے پورا فائدہ اٹھایا جاسکے۔ جیسا کہ آپ کو معلوم ہے، ہماری فقہ کا اصل ذخیرہ عربی زبان میں ہے اور ہمارا تعلیم یافتہ طبقہ بالعموم اس زبان سے ناواقف ہے۔ اس ناواقفیت کی وجہ سے، اور کچھ سنی سنائی باتوں کی بنا پر، ہمارے پڑھے لکھے لوگ عموماً اس فقہی ذخیرے کے متعلق طرح طرح کی

بدگمانیاں رکھتے ہیں۔ حتیٰ کہ ان میں سے بہت سے لوگ تو یہاں تک کہہ بیٹھتے ہیں کہ دور از کار لاطائل اختلافی بحثوں کے اس دفترِ بے معنی کو دریا برد کر دیا جائے اور نئے سرے سے اجتہاد کر کے کام چلایا جائے۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ جو لوگ اس قسم کے مہمل خیالات ظاہر کرتے ہیں وہ محض اپنے علم ہی کی کمی کا نہیں، فکر و تدبر کے فقدان کا بھی راز فاش کرتے ہیں۔ اگر وہ اپنے بزرگوں کے فقہی کارناموں کا واقعی مطالعہ کریں تو مجھے یقین ہے کہ انہیں اپنی ان باتوں پر خود ہی شرم آنے لگیگی۔ انہیں معلوم ہوگا کہ پچھلی بارہ تیرہ صدیوں میں ہمارے اسلاف محض فضول بحثوں میں وقت ضائع نہیں کرتے رہے ہیں بلکہ انھوں نے اپنے بعد آنے والی نسلوں کے لئے بڑی قیمتی میراث چھوڑی ہے۔ وہ بہت سی ابتدائی منزلیں ہمارے لئے تعمیر کر گئے ہیں اور ہم سے بڑھکر زیاں کار کوئی نہ ہوگا اگر ہم محض جہالت کی بنا پر اس بنی بنائی عمارت کو خواہ مخواہ ڈھا کر نئے سرے سے ہی تعمیر کی ابتدا کرنے پر اصرار کریں۔ ہمارے لئے عقلمندی یہی ہے کہ جو اگلے بنا گئے ہیں اُسے اپنی آج کی ضرورتوں کے لئے کار آمد بنائیں، اور آگے جن چیزوں کی ضرورت پیش آئے اس کے لئے مزید تعمیر کرتے رہیں۔ ورنہ ہر نسل اگر یونہی اپنے سے پہلی نسلوں کے کام پر پانی پھیرتی رہے اور نئے سرے سے سب کچھ بنانے کی کوشش کرے تو یقیناً ترقی کی طرف قدم آگے بڑھ ہی نہیں سکتا۔

میں اس سلسلہ کی پہلی تقریر میں عرض کر چکا ہوں کہ پچھلی صدیوں میں دنیا کے ایک بہت بڑے حصّے پر مسلمانوں کی جس قدر سلطنتیں قائم ہوئی تھیں ان سب کا قانون فقہ اسلامی ہی تھی۔ اس زمانے میں مسلمان نری گھاس نہیں کھودتے تھے بلکہ ایک اعلیٰ درجہ کا تمدن ان کے اندر موجود تھا۔ ان کے وسیع تمدن کی ساری ہی ضروریات پر ان کے فقہا نے اسلامی قوانین کو منطبق کیا تھا۔ یہی فقہا ان حکومتوں کے جج مجسٹریٹ اور چیف جسٹس ہوتے تھے اور ان کے فیصلوں سے نظائر کا ایک وسیع ذخیرہ فراہم ہو گیا تھا۔ انہوں نے قریب قریب ہر شعبہ قانون سے بحث کی ہے۔ محض دیوانی و فوجداری قوانین ہی نہیں، دستوری اور بین الاقوامی قوانین کے متعلق بھی ان کے قلم سے ایسی ایسی لطیف بحثیں نکلی ہیں کہ ان کا مطالعہ کر کے ایک قانون داں آدمی ان کی ژرف نگاہی کی داد دیے بغیر نہیں رہ سکتا۔

ضرورت ہے کہ ہم اہل علم کے ایک گروہ کو ان بزرگوں کے چھوڑے ہوئے ذخیرہ کا جائزہ لینے پر مامور کریں، اور وہ موجودہ زمانے کی قانونی کتابوں کے طرز پر اس تمام کارآمد مواد کو مرتب کر ڈالے جو اس ذخیرے میں مل سکتا ہو۔

خصوصیت کے ساتھ چند کتابیں تو ایسی ہیں جن کو اُردو زبان میں منتقل کر لینا نہایت ضروری ہے:

۱۔ احکام القرآن پر تین کتابیں، جصّاص، ابن العربی اور قرطبی۔

ان کتابوں کا مطالعہ ہمارے قانونی طلبہ کو قرآن مجید سے احکام مستنبط کرنے کی بہترین تربیت دے گا۔ ان میں قرآن کی تمام احکامی آیات کی تفسیر کی گئی ہے، احادیث اور آثار صحابہ میں ان کی جو تشریح ملتی ہے اسے نقل کیا گیا ہے، اور مختلف ائمہ مجتہدین نے ان سے جو احکام نکالے ہیں انہیں ان کے دلائل سمیت مفصل بیان کر دیا گیا ہے۔

۲۔ دوسرا قیمتی ذخیرہ کتب حدیث کی شرحوں کا ہے جن میں احکام کے علاوہ نظائر اور تشریحی بیان کا بھی بہترین مواد ملتا ہے۔ ان میں خاص طور پر یہ کتابیں اُردو میں منتقل ہونی چاہئیں۔

بخاری پر	فتح الباری اور عینی
مسلم پر	نووی اور مولانا شبیر احمد صاحب عثمانی کی فتح الملہم۔
ابوداؤد پر	عون المعبود اور بذل المجہود۔
موطا پر	شاہ ولی اللہ صاحب کی مسوّی اور مصفّیٰ۔ اور موجودہ دور کے ایک ہندوستانی عالم کی اوجز المسالک
منتقی الاخبار پر	شوکانی کی نیل الاوطار
مشکوٰۃ پر	مولانا محمد ادریس کاندھلوی کی التعلیق الصبیح۔
علم الآثار میں	امام طحاوی کی شرح معانی الآثار۔

۳۔ اس کے بعد ہمیں فقہ کی ان بڑی بڑی کتابوں کو لینا چاہیئے جو اس علم میں امہات کتب کا درجہ رکھتی ہیں۔ ان میں خصوصیت کے ساتھ یہ کتابیں اُردو میں منتقل ہونی چاہئیں:

فقہ حنفی پر	امام سرخسی کی المبسوط اور شرح السیر الکبیر۔ کاشانی کی بدائع الصنائع۔ ابن ہمام کی فتح القدیر شرح ہدایہ۔ اور فتاویٰ عالمگیری
فقہ شافعی پر	کتاب الام۔ شرح المہذب اور مغنی المحتاج
فقہ مالکی پر	المدونہ اور کوئی اہم کتاب جس کو اہل علم انتخاب کریں۔
فقہ حنبلی پر	ابن قدامہ کی المغنی
فقہ ظاہری پر	ابن حزم کی المحلی
مذاہب اربعہ پر	ابن رشد کی بدایۃ المجتہد۔ اور علماء مصر کی مرتب کردہ الفقہ فی المذاہب الاربعہ
مخصوص مسائل پر	امام ابو یوسف کی کتاب الخراج۔ یحییٰ بن آدم کی الخراج۔ ابو عبید القاسم کی کتاب الاموال۔ ہلال بن یحییٰ کی احکام الوقف دمیاطی کی احکام المواریث۔

۴۔ پھر ہمیں اصول قانون اور حکمت تشریع کی بھی چند اہم کتابوں کو اُردو کا جامہ پہنا لینا چاہئیے تاکہ ان کی مدد سے ہمارے اہل قانون میں اسلامی فقہ کا صحیح فہم اور اس کی روح سے گہری واقفیت پیدا ہو۔ میرے خیال میں اس موضوع پر یہ کتابیں قابل انتخاب ہیں۔ ابن حزم کی اصول الاحکام۔ علامہ آمدی کی الاحکام لاصول الاحکام خضری کی اصول الفقہ۔ امام شاطبی کی الموافقات۔ ابن القیم کی اعلام الموقعین۔ اور شاہ ولی اللہ صاحب کی حجۃ اللہ البالغہ۔

ان کتابوں کے متعلق ہمیں صرف اتنا ہی نہیں کرنا ہے کہ محض ان کے ترجمے اُردو زبان میں کر ڈالے جائیں، بلکہ ان کے مضامین کو موجودہ زمانہ کی قانونی کتابوں کے طرز پر از سر نو مرتب بھی کرنا ہوگا۔ نئے عنوانات قائم کرنے ہوں گے منتشر مسائل کو ایک ایک عنوان کے تحت جمع کرنا ہوگا، فہرستیں بنانی پڑینگی اور انڈکس تیار کرنے ہونگے۔ اس محنت کے بغیر

یہ کتابیں آج کل کی ضروریات کے لئے پوری طرح کار آمد نہیں ہو سکتیں۔ قدیم زمانے کا طریق تدوین کچھ اور تھا اور اس زمانے میں قانونی مسائل کے لئے اتنے مختلف عنوانات بھی پیدا نہیں ہوئے تھے جتنے آج پیدا ہو گئے ہیں۔ مثال کے طور پر وہ دستوری قانون اور بین الاقوامی قانون کے لئے کوئی الگ نام نہیں رکھتے تھے بلکہ ان کے مسائل کو وہ نکاح، خراج، جہاد اور میراث کے ابواب میں بیان کرتے تھے۔ فوجداری قانون ان کے ہاں کوئی الگ عنوان نہ تھا، بلکہ اس کے مسائل، حدود، جنایات اور دیات کے مختلف عنوانوں میں تقسیم کئے جاتے تھے۔ دیوانی قانون کو بھی انہوں نے الگ مرتب نہیں کیا تھا بلکہ ایک ہی مجموعہ قوانین میں بہت سے عنوانات کے تحت اس کو جمع کر دیا تھا۔ مالیات اور معاشیات وغیرہ نام ان کے ہاں نہ تھے۔ اس سلسلہ کے مسائل کو وہ کتاب البیوع، کتاب الصرف، کتاب المضاربہ، اور کتاب المزارعہ وغیرہ عنوانات کے تحت بیان کرتے تھے۔ اسی طرح قانون شہادت، ضابطہ دیوانی، ضابطہ فوجداری، اور ضابطہ عدالت وغیرہ کی جدید اصطلاحیں ان کے ہاں نہیں بنی تھیں۔ ان قوانین کے مسائل ان کی کتابوں میں آداب القاضی، کتاب الدعویٰ، کتاب الاکراہ، کتاب الشہادات اور کتاب الاقرار وغیرہ عنوانات کے تحت ملتے ہیں۔ اب اگر یہ کتابیں جوں کی توں اردو میں منتقل کر دی جائیں تو ان سے کما حقہ فائدہ اٹھانا مشکل ہے۔ ضرورت ہے کہ کچھ قانونی نظر رکھنے والے اہل علم ان پر کام کریں اور ان کی ترتیب بدل کر ان کے مواد کو جدید طرز پر مرتب کر دیں۔ اور بالفرض اگر یہ بہت زیادہ محنت طلب کام نظر آئے تو کم از کم اتنا تو ضرور ہی ہونا چاہیئے کہ ان کی فہرستیں پوری یا جدید طرز کے ساتھ بنائی جائیں، اور ایسے مختلف قسم کے انڈکس بنائے جائیں جن کے ذریعہ سے ان میں مسائل کا تلاش کرنا آسان ہو جائے۔

تدوین احکام اس سلسلہ کا دوسرا اہم کام یہ ہے کہ علماء اور ماہرین قانون کی ایک ایسی مجلس مقرر کی جائے جو اسلام کے قانونی احکام کو جدید دور کی کتب قانون کے طرز پر دفعہ وار مدون

(Codify) کردے۔

میں اپنی پہلی تقریر میں وضاحت کے ساتھ یہ بات آپ سے عرض کر چکا ہوں کہ اسلامی نقطۂ نظر سے قانون کا اطلاق ہر اس قول پر نہیں ہوتا جو کسی فقیہ یا امام مجتہد کی زبان سے نکلا ہو یا کسی فقہی کتاب میں لکھا ہوا ہو۔ قانون صرف چار چیزوں کا نام ہے :۔

۱۔ کوئی حکم جو قرآن میں اللہ تعالیٰ نے دیا ہو،

۲۔ کسی قرآنی حکم کی تشریح و تفصیل، یا کوئی مستقل حکم جو نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے ثابت ہو،

۳۔ کوئی استنباط، قیاس، اجتہاد یا استحسان جس پر امت کا اجماع ہو، یا جمہور علماء کا ایسا فتویٰ ہو جسے ہمارے ملک کے مسلمانوں کی عظیم اکثریت تسلیم کرتی رہی ہے۔

۴۔ اسی قبیل کا کوئی ایسا امر جس پر ہمارے ملک کے اہل حل و عقد کا اب اجماعی یا جمہوری فیصلہ ہو جائے۔

میری تجویز یہ ہے کہ پہلی تین قسموں کے احکام کو ماہرین کی ایک جماعت ایک مجلۂ احکام (Code) کی شکل میں مرتب کر دے۔ پھر جو جو قوانین آئندہ اجماعی یا جمہوری فیصلوں سے بنتے جائیں ان کا اضافہ ہماری کتاب آئین میں کیا جاتا رہے۔ اگر اس قسم کا ایک مجلۂ احکام بن جائے تو اصل قانون کی کتاب وہ ہوگی، اور باقی تمام فقہی کتابیں اس کے لئے شرح (Commentary) کی حیثیت میں ہونگی۔ نیز اس طرح عدالتوں میں قانون اسلامی کی تنفیذ اور لا کالجوں میں اس قانون کی تعلیم بھی آسان ہو جائیگی۔

قانونی تعلیم کی اصلاح تیسرا ضروری کام یہ ہے کہ ہم اپنے ہاں قانون کی تعلیم کا سابق طریقہ بدل دیں اور اپنے لا کالجوں کے نصاب اور طریق تربیت میں ایسی اصلاحات کریں جن سے طلبہ اسلامی قانون کی تنفیذ کے لئے علمی اور اخلاقی، دونوں حیثیتوں سے تیار ہو سکیں۔

اس وقت تک جو تعلیم ہماری قانونی درس گاہوں میں دی جا رہی ہے وہ ہمارے نقطۂ نظر سے بالکل ناکارہ ہے۔ اس سے فارغ ہو کر نکلنے والے طالب علم صرف یہی نہیں کہ اسلامی قانون کے علم سے بے بہرہ

جاتے ہیں۔ بلکہ ان کی ذہنیت بھی غیر اسلامی افکار کے سانچے میں ڈھل جاتی ہے، اور ان کے اندر اخلاقی صفات بھی ویسی ہی پیدا ہو جاتی ہیں جو مغربی قوانین کے اجرا کے لئے موزوں ترین، مگر اسلامی قانون کو نافذ کرنے کے لئے قطعاً غیر موزوں ہیں۔ اس صورت حال کو جب تک ہم بدل نہ دیں گے اور ان درسگاہوں میں اپنے معیار کے فقیہ پیدا کرنے کا انتظام نہ کریں گے، ہمارے ہاں وہ آدمی فراہم ہی نہ ہو سکیں گے جو ہماری عدالتوں میں قاضی اور مفتی کے فرائض انجام دینے کے لائق ہوں۔

اس مقصد کے لئے جو تجاویز میرے ذہن میں ہیں وہ میں آپ کے سامنے پیش کرتا ہوں۔ دوسرے اہل علم بھی ان پر غور کریں اور ان میں اصلاح و اضافہ فرمائیں تاکہ ایک اچھی قابل عمل اسکیم بن سکے۔

۱۔ سب سے مقدم اصلاح یہ ہونی چاہیئے کہ آئندہ سے لا کالجوں میں داخلہ کے لئے عربی زبان کی واقفیت ـــــ اتنی واقفیت جو قرآن، حدیث اور فقہ کا مطالعہ کرنے کے لئے کافی ہو ـــــ لازم قرار دی جائے۔ اگرچہ ہم اسلامی قانون کی پوری تعلیم اردو میں دینا چاہتے ہیں، اور اس فن کی تمام ضروری کتابوں کو بھی اردو میں منتقل کر لینا چاہتے ہیں، لیکن اس کے باوجود عربی زبان کے علم کی ضرورت پھر بھی باقی رہیگی۔ اس لئے کہ اسلامی فقہ میں بصیرت بہرحال اس وقت تک پیدا نہیں ہو سکتی جب تک آدمی اس زبان سے واقف نہ ہو جس میں قرآن نازل ہوا ہے اور جس میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے کلام فرمایا ہے۔ ابتداءً ہمیں لا کالجوں کے لئے عربی داں امیدوار فراہم کرنے میں دشواری ضرور پیش آئیگی۔ ممکن ہے اس غرض کے لئے ہم کو چند سال تک ہر لا کالج میں ایک مستقل کلاس عربی تعلیم کے لئے کھولنی پڑے، اور شاید تعلیم قانون کی مدت میں ایک سال کا اضافہ بھی کر دینا پڑے۔ لیکن آگے چل کر جب ہمارے پورے نظام تعلیم میں عربی بطور ایک لازمی زبان کے شامل ہو جائیگی تو لا کالج میں داخلہ کے لئے جو گریجویٹ بھی آئیں گے وہ پہلے ہی عربی زبان سے بخوبی واقف ہونگے۔

۲۔ عربی زبان کے ساتھ ساتھ یہ بھی ضروری ہے کہ قانون کی تعلیم شروع کرنے سے پہلے طلبہ کو قرآن اور حدیث کے براہ راست مطالعہ سے دین کا مزاج اور اس کا پورا نظام اچھی طرح سمجھا دیا جائے۔ ہماری عربی درسگاہوں میں بھی ایک مدت دراز سے یہ غلط طریقہ چلا آ رہا ہے کہ تعلیم کی ابتدا فقہ سے کی جاتی ہے

پھر ہر مذہب (اسکول) کے لوگ اپنے مخصوص فقہی نقطۂ نظر سے حدیث پڑھاتے ہیں، اور قرآن کی صرف ایک یا دو بڑی سورتیں محض تبرکاً داخلِ درس کر دی جاتی ہیں۔ بلکہ ان میں بھی کلامِ الٰہی کی ادبی خوبیوں کے سوا کسی اور چیز کی طرف توجہ نہیں کی جاتی۔ اس کا نقصان یہ ہوتا ہے کہ جو طلبہ ان درس گاہوں سے نکلتے ہیں وہ قانون کی جزئیات و فروع سے تو خوب واقف ہوتے ہیں مگر اس دین کو جس کو قائم کرنے کے لئے یہ قانون بنایا گیا ہے اس کے مجموعی نظام، اس کے مقاصد، اس کے مزاج اور اس کی روح سے بڑی حد تک نابلد رہتے ہیں۔ ان کو یہ تک نہیں معلوم ہوتا کہ دین سے شریعت کا اور شریعت سے فقہی مذاہب کا تعلق کیا ہے۔ وہ قانونی جزئیات اور اپنے مذہب خاص کے فروعی مسائل ہی کو اصل دین سمجھتے ہیں اسی چیز نے ہمارے اندر فرقہ بندی کے جھگڑے اور تعصبات پیدا کئے ہیں، اور اسی چیز کا نتیجہ یہ ہے کہ مسائل زندگی پر فقہی احکام کا انطباق کرنے میں بار بار شریعت کے اہم ترین مقاصد تک نظر انداز کر دیئے جاتے ہیں۔ ہم چاہتے ہیں کہ اب اس غلطی کی اصلاح ہو اور کسی طالب علم کو اس وقت تک قانون نہ پڑھایا جائے جب تک وہ پہلے قرآن سے اور پھر حدیث سے دین کو اچھی طرح سمجھ نہ لے۔

اس معاملہ میں بھی ہمیں ابتداءً چند سال تک کچھ مشکلات کا سامنا کرنا ہوگا۔ کیونکہ قرآن و حدیث سے واقف لوگ بکثرت نہ مل سکیں گے، اور اس کے لئے شاید ہمیں لا کالجوں ہی میں اس تعلیم کا بھی انتظام کرنا پڑے گا۔ لیکن آگے چل کر جب ہماری عام تعلیمی اصلاحات بار آور ہو جائیں گی تو آسانی کے ساتھ یہ ضابطہ بنایا جا سکے گا کہ لا کالجوں میں صرف وہی طلبہ داخل لئے جا سکتے ہیں جو تفسیر و حدیث کو مخصوص مضامین کی حیثیت سے لے کر بی اے کر چکے ہوں، ورنہ دوسرے مضامین کے طلبہ کو ایک سال اور ان مضامین پر صرف کرنا ہوگا۔

۳۔ تعلیم قانون کے نصاب میں تین چیزیں ضرور شامل ہونی چاہئیں۔ ایک، جدید زمانے کے اصولِ قانون (Jurisprudence) کے ساتھ ساتھ اصولِ فقہ کا مطالعہ۔ دوسرے اسلامی فقہ کی تاریخ کا مطالعہ۔ تیسرے فقہ کے تمام چھوٹے بڑے مذاہب (اسکولوں) کا غیر متعصبانہ مطالعہ۔ ان تینوں چیزوں کے بغیر طلبہ میں نہ تو فقہ کا پورا فہم پیدا ہو سکتا ہے

نہ ان کے اندر وہ اجتہادی صلاحیتیں اُبھر سکتی ہیں جو اعلیٰ درجہ کے قاضی اور مفتی بننے کے لئے ناگزیر ہیں، اور نہ ان کے اندر سے ایسے ماہرین نکل سکتے ہیں جو ہماری ترقی پذیر ریاست کی روز افزوں ضروریات کے لئے تعبیر و قیاس اور اجتہاد و استحسان کے صحیح طریقے استعمال کر کے قوانین بنا سکیں۔ اپنے قانون کے اصولوں کو پوری طرح سمجھے بغیر آخر وہ روز نت نئے پیش آنے والے مسائل پر ان کا انطباق کیسے کر سکیں گے۔ اپنی فقہ کی تاریخ کو جانے بغیر انہیں کیونکر معلوم ہوگا کہ اسلامی قانون کا ارتقا کس طریقہ پر ہوا ہے اور آئندہ کس طریقہ پر ہو سکتا ہے۔ فقہ اسلام کے جمع کئے ہوئے پورے ذخیرے پر وسیع نظر رکھے بغیر وہ کیونکر اس قابل ہو سکیں گے کہ جب کسی مسئلے میں ایک فقہی مذہب سے رہنمائی نہ ملتی ہو تو نیا اجتہاد کرنے سے پہلے دوسرے مذاہب فقہ سے استفادہ کر لیں۔ انہی وجوہ سے میں ضروری سمجھتا ہوں کہ ہماری تعلیم قانون کے نصاب میں یہ تینوں مضامین داخل ہوں۔

۴۔ تعلیم کی اس اصلاح کے ساتھ ہمیں اپنے لاکالجوں میں طلبہ کی اخلاقی تربیت کا بھی خاص اہتمام کرنا ہوگا۔ اسلامی نقطۂ نظر سے لا کالج چالاک وکیل، نفس پرست مجسٹریٹ اور بدکردار جج تیار کرنے کی فیکٹری نہیں ہے بلکہ اس کا کام تو ایسے قاضی اور مفتی پیدا کرنا ہے جو اپنی قوم میں اپنی سیرت و کردار کے لحاظ سے بلند ترین لوگ ہوں، جن کی راستبازی اور عدل و انصاف پر کامل اعتماد کیا جا سکے، جن کی اخلاقی ساکھ ہر شبہ سے بالا تر ہو۔ یہ وہ جگہ ہے جہاں سب سے بڑھ کر خدا ترسی، پرہیزگاری اور احساس ذمہ داری کا دور دورہ ہونا چاہیئے۔ یہاں سے نکلنے والے طلبہ کو اُس مسند کے لئے تیار ہونا ہے جس پر کبھی قاضی شریح، امام ابوحنیفہ، امام مالک، امام احمد ابن حنبل اور قاضی ابویوسف جیسے لوگ بیٹھ چکے ہیں۔ یہاں ایسے مضبوط کیرکٹر کے آدمی تیار ہونے چاہئیں جو کسی مسند شرعی میں فتویٰ دیتے وقت یا کسی معاملہ کا فیصلہ کرتے وقت خدا کے سوا کسی کی طرف نظر نہ رکھیں، کوئی لالچ، کوئی خوف، کوئی ذاتی دلچسپی، کوئی محبت اور کوئی نفرت ان کو اُس بات سے نہ ہٹا سکے جسے وہ اپنے علم اور اپنے ضمیر کے لحاظ سے حق اور انصاف کی بات سمجھتے ہوں۔

عدالتی نظام کی اصلاح اسلامی قانون کے اجراء کی خاطر زمین ہموار کرنے کے لئے ہمیں اپنے عدالتی نظام میں بھی بہت کچھ تبدیلیاں کرنی ہونگی۔ اس سلسلہ کی چھوٹی چھوٹی تفصیلات کو چھوڑ کر میں دو چیزوں کا خاص طور پر ذکر کرونگا جو اسلامی نقطۂ نظر سے بہت اہمیت رکھتی ہیں۔

پیشۂ وکالت کا انسداد اولین اصلاح طلب معاملہ پیشۂ وکالت کا ہے جو موجودہ عدالتی نظام کی بدترین خرابیوں میں سے ایک، بلکہ شاید سب سے بدترین چیز ہے۔ اخلاقی اعتبار سے اس کے جواز میں ایک حرف نہیں کہا جاسکتا۔ عملی حیثیت سے عدالتی کام کی کوئی حقیقی ضرورت ایسی نہیں ہے جو اس کے بجائے کسی دوسرے مناسب طریقہ سے پوری نہ کی جاسکتی ہو۔ اور اسلام کے مزاج سے یہ پیشۂ قانون بازی اس قدر بُعد رکھتا ہے کہ جب تک یہ پیشہ جاری ہے۔ ہماری عدالتوں میں اسلامی قانون اپنی صحیح اسپرٹ کے ساتھ جاری ہی نہیں ہو سکتا، بلکہ اگر کہیں خدائی قانون کے ساتھ یہاں وہ بازی گری کی گئی جو انسانی قانون کے ساتھ روز کی جارہی ہے تو عجب نہیں کہ ہم انصاف کے ساتھ ایمان بھی کھو بیٹھیں۔ لہٰذا یہ نہایت ضروری ہے کہ اس پیشہ کو بتدریج ختم کردیا جائے۔

نظری حیثیت سے وکیل کا کام یہ ہے کہ وہ عدالت کو قانون سمجھنے اور مقدمۂ زیر سماعت کے حالات پر اسے منطبق کرنے میں مدد دے۔ اصولاً یہ ضرورت اپنی جگہ مسلّم ہے۔ یہ بھی درست ہے کہ ایک مقدمہ میں دو ماہرین قانون کی رائیں مختلف ہو سکتی ہیں، ہو سکتا ہے کہ ایک کی رائے میں ایک فریق کا مقدمہ مضبوط ہو تو دوسرے کی رائے میں دوسرے فریق کا، اور عدالت کے لئے صحیح نتیجہ پر پہنچنے میں دونوں طرف کے دلائل سے مطلع ہونا یقیناً مفید ہوتا ہے۔ لیکن سوال یہ ہے کہ اس نظریہ کو عملی جامہ پہنانے کی جو صورت طریقۂ وکالت کی شکل میں اختیار کی گئی ہے، کیا فی الواقع اس سے یہ دونوں فائدے حاصل ہوتے ہیں؟ ایک وکیل اپنی قانونی مہارت کو بیکر بازار میں بیٹھ جاتا ہے اور تیار رہتا ہے کہ جس مقدمہ کا جو فریق بھی اس کے دماغ کا کرایہ ادا کرنے کے لئے تیار ہو اس کے حق میں وہ قانونی نکات سوچنا شروع کردے۔ اس کو اس سے کوئی بحث نہیں ہوتی کہ میرا موکل حق پر ہے یا باطل پر، مجرم ہے یا بے گناہ، اپنا حق لینا چاہتا ہے یا دوسرے کا حق مار کھانا چاہتا ہے۔ اس کو اس سے بھی کوئی دلچسپی

نہیں ہوتی کہ قانون کا منشا درحقیقت کیا ہے اور اس کی رو سے اس کے موکل کا مقدمہ صحیح ہے یا غلط۔ وہ صرف یہ دیکھتا ہے کہ اس شخص نے مجھے فیس دی ہے اور میرا کام اس کی حمایت کرنا ہے۔ اس لئے وہ مقدمہ کو چھیل بنا کر قانون کے مطابق ڈھالتا ہے، کمزور پہلوؤں کو چھپاتا ہے، موافق پہلوؤں کو ابھارتا ہے، روداد مقدمہ اور شہادتوں میں سے چن چن کر صرف وہ چیزیں نکالتا ہے جو اس کے موکل کی تائید میں ہوں، گواہوں کو توڑنے کی کوشش کرتا ہے تاکہ مقدمہ کے صحیح واقعات ــــ اگر وہ اس کے موکل کے خلاف پڑتے ہوں ــــ روشنی میں نہ آسکیں یا کم از کم مشتبہ ہو جائیں، اور قانون کی صرف مفید مطلب تعبیریں پیش کرکے اور ان کے حق میں دلائل دے کر جج کو گمراہ کرنا چاہتا ہے تاکہ اس کے قلم سے وہ فیصلہ نکلے جو اس کے موکل کے موافق ہو نہ کہ وہ جو تقاضائے انصاف ہو۔ اب خواہ کوئی حقیقی مجرم چھوٹ جائے یا کوئی واقعی بے گناہ پھنس جائے، کوئی حق دار بے حق ہو جائے یا غیر مستحق دوسرے کا حق مار کھائے، وکیل اس کی کچھ پروا نہیں کرتا۔ وہ حق کی حمایت کرنے اور انصاف کرانے کے لئے وکالت خانے میں نہیں بیٹھتا۔ اس کا مقصد ہوتا ہے روپیہ۔ جو اسے روپیہ دے وہی حق پر ہے، خواہ وہ مقدمہ کا ایک فریق ہو یا دوسرا فریق ــــ میں پوچھتا ہوں، کیا کسی اصولِ اخلاق کے لحاظ سے یہ پیشہ ورانہ قانون بازی جائز ٹھیرائی جا سکتی ہے؟ کیا کوئی صاحبِ ضمیر، خدا ترس اور ایماندار آدمی محض فیس کی خاطر اتنی بڑی ذمہ داری اپنے سر لے سکتا ہے کہ مظلوم کو داد سے محروم کرائے اور ظالم کا ظلم برقرار رکھنے کی کوشش کرے؟ اور کیا فی الواقع ایسے ماہرینِ قانون کا مشورہ ججوں کو انصاف کے کام میں کچھ بھی مدد دے سکتا ہے جو علانیہ اس مقصد کے لئے فیس لئے بیٹھے ہوں کہ قانون کی تعبیر لازماً اپنے موکل ہی کے حق میں کریں گے؟ کیا کسی قانونی مسئلہ میں ایک مقدمہ کے دو مخالف وکیلوں کا اختلافِ رائے حقیقی ایماندارانہ اختلاف رائے ہوتا ہے، درانحالیکہ یہی دونوں وکیل اتنے ہی زور کے ساتھ بالکل برعکس رائیں پیش کرتے اگر دونوں کے موکل بدلے ہوئے ہوتے؟

حقیقت یہ ہے کہ اس پیشۂ وکالت نے صرف ہمارے نظام عدل و انصاف ہی کو سخت نقصان نہیں پہنچایا ہے، اور صرف اتنا ہی نہیں کیا ہے کہ ہماری سوسائٹی میں قانون کی پیروی کے بجائے اس کی

خلاف ورزی کو وسعت و طاقت بخشی ہو، بلکہ اس کا نقصان ہماری پوری اجتماعی زندگی میں پھیل گیا ہے، اور ہماری سیاست بھی اسی کی وجہ سے گندی ہو کر رہ گئی ہے۔ زبان اور ضمیر کا تعلق منقطع کرنے کی مشق آپ کے کالجوں کی مجالس مباحثہ سے شروع ہوتی ہے۔ یہاں ایک بولنے والے کی اصل خوبی یہی سمجھی جاتی ہے کہ وہ مسئلہ زیر بحث کے دونوں پہلوؤں کی حمایت میں یکساں زور کے ساتھ بول سکے، اور جس جانب سے بھی کھڑا ہو جائے، دلائل کے انبار لگا دے خواہ اس کی ذاتی رائے اس کے خلاف ہی کیوں نہ ہو۔ یہ ابتدائی مشق پیشہ وکالت میں داخل ہو کر خوب منجھتی اور پختہ ہوتی ہے۔ پھر جب ایک وکیل سالہا سال تک دل کے خلاف دماغ لڑانے اور ضمیر کے خلاف زبان چلانے میں ماہر کامل ہو چکتا ہے تب وہ اپنی اسی سیرت کو لئے ہوئے ہماری قومی زندگی (Public character) میں داخل ہوتا ہے اور اپنے اس اخلاقی زہر کو ہمارے علمی، تمدنی اور سیاسی اداروں میں ہر طرف پھیلا دیتا ہے۔

اسلام اس پیشہ کو کسی طرح برداشت کرنے کے لئے تیار نہیں ہے۔ اس کے نظام میں اس کے لئے کوئی جگہ نہیں۔ یہ اس کے مزاج اور اس کی روح اور اس کی روایات کے بالکل خلاف ہے۔ پچھلی دس بارہ صدیوں میں آدھی سے زیادہ دنیا پر مسلمانوں نے حکومت کی ہے اور کہیں ان کے نظام عدالت میں اس قانونی پیشے کا نشان ہمیں نہیں ملتا۔ اس کے بجائے ہمارے ہاں مفتی کا منصب تھا اور اب ہمیں اسی کو تازہ کرنا چاہیے۔ قدیم زمانے کے مفتی زیادہ تر اپنی روزی کسی آزاد کاروبار سے کماتے تھے۔ اور لوگوں کو فتوے بلا معاوضہ دیا کرتے تھے۔ آج کی بڑھی ہوئی ضروریات کے لئے ہم ایسا کر سکتے ہیں کہ ہر شہر اور ہر ضلع اور تحصیل کی ضرورتوں کے مطابق ایک کافی تعداد میں ماہرین قانون ـــــ جن میں مخصوص شعبہ ہائے قانون کے اختصاصی ماہرین بھی شامل ہوں ـــــ سرکاری طور پر مقرر کر دیئے جائیں اور ان کو پبلک کے خزانے سے معقول تنخواہیں دی جائیں۔ ان کے پاس فریقین مقدمہ کا جانا اور ان کی کچھ "خدمت" کرنا قانوناً ممنوع ہو۔ اور اسی طرح حکومت کو بھی ان کی رائے پر اثر ڈالنے کا اسی طرح کوئی حق نہ ہو جس طرح حاکمان عدالت پر دباؤ ڈالنے کا اسے حق نہیں ہے۔ عدالتیں خود حسب موقع

ان ماہرین کے پاس مقدمات کی روداد بھیجیں اور ان سے رائے لیں۔ اگر ان کے درمیان اختلاف رائے ہو تو وہ عدالت میں آکر اپنے استدلال پیش کریں۔ مقدمہ کے واقعات کی تحقیق کے لئے عدالت خود بھی گواہوں پر جرح کرے اور مفتیوں کو بھی موقع دیا جائے کہ وہ گواہوں سے تمام ایسے متعلق حالات معلوم کریں جن کا مقدمہ پر اثر پڑتا ہو۔ اس طرح عدالتوں کو قانون سمجھنے اور مقدمات پر اس کو منطبق کرنے میں حقیقی مدد ملے گی۔ مفتیوں کا سچا اختلاف رائے بہت سے قانونی مسائل کو صاف کریگا، عدالتوں کا بہت سا وقت، جو بنے ہوئے مقدمات اور مصنوعی شہادتوں کی وجہ سے اب ضائع ہوا کرتا ہے، بچ جائیگا، اور مقدمہ بازی جس کی ساری گرم بازاری اس قانونی پیشے ہی کی بدولت ہے، ہمارے معاشرے سے رخصت ہو جائیگی

رہا یہ سوال کہ اگر مقدمات کو ضابطہ کے مطابق تیار کر کے عدالتوں کے سامنے پیش کرنے والے صاحب فن لوگ موجود نہ ہوں تو اہل مقدمات کو بڑی پریشانیاں لاحق ہونگی اور وہ طرح طرح کے بے ضابطہ طریقوں سے اپنے معاملات پیش کر کر کے عدالتوں کو بھی پریشان کریں گے، تو اس کا حل یہ ہے کہ ہم اس کے لئے مختاری کے اُس پرانے طریقہ کو زندہ کریں جو ہماری عدالتوں میں پہلے رائج تھا۔ ہمارے لا کالجوں کے ساتھ ایسی ضمنی کلاسیں بھی ہونی چاہئیں جن میں متوسط درجہ کے تعلیم یافتہ لوگوں کو صرف قانون ضابطہ (Procedural law) پڑھایا جائے اور عملاً عدالتی طریق کار سے واقف کرایا جائے۔ ان لوگوں کا کام محض یہ ہونا چاہیئے کہ ایک مقدمہ کو ضابطہ کی صورت دیکر عدالت کے سامنے پیش کرنے کے قابل بنا دیں اور مختلف مراحل پر اہل مقدمات کو عدالتی طریق کار بتاتے رہیں۔ یہ لوگ اگر فیس لے کر پریکٹس کریں تو اس سے وہ خرابیاں رونما نہیں ہو سکتیں جو پیشۂ وکالت سے رونما ہوتی ہیں۔

کورٹ فیس کا انسداد ملک کے نظام عدل و انصاف کو اسلامی معیار پر لانے کے لئے ایک اور ضروری اصلاح یہ ہے کہ ہم اپنے ہاں سے کورٹ فیس بالکل اڑا دیں۔ یہ ایک ایسی گھناؤنی بدعت ہے جس سے ہم مسلمان مغربی تسلط سے پہلے کبھی آشنا نہیں ہوئے تھے۔ اسلامی مذاق پر یہ تصور

ہی سخت گراں ہے کہ عدالت داد رسی کی خدمت انجام دینے کے بجائے انصاف کی دوکان بن کر رہے جہاں سے کوئی شخص پیسہ دیئے بغیر جنس عدل حاصل نہ کر سکتا ہو، اور جہاں بے زر انسان کے لئے یہی مقدر ہو کہ ظلم سہے اور داد نہ پائے۔ ہم چاہتے ہیں کہ انگریزی دور کے ساتھ اس کی یہ یادگار بھی رخصت ہو اور ہماری عدالتیں پھر سے اس اسلامی معیار پر قائم ہو جائیں جس کی رو سے انصاف رسانی ایک تجارتی کاروبار نہیں بلکہ ایک عبادت اور ایک خدمتِ بے مُزد ہے۔

آپ سوال کر سکتے ہیں کہ اگر کورٹ فیس اڑا دی جائے تو آخر عدالتی نظام کے مصارف کہاں سے پورے ہوں گے؟ میں اس کے جواب میں دو باتیں عرض کرونگا۔

ایک یہ کہ اسلامی نظام میں اتنے لمبے چوڑے عدالتی عملے کی ضرورت باقی نہ رہیگی جسے موجودہ حالات نے ناگزیر بنا رکھا ہے۔ پیشۂ وکالت کا انسداد مقدمہ بازی کو بہت کم کر دیگا اور مقدمات کا دوران بھی آجکل کی بہ نسبت بہت گھٹ جائیگا۔ پھر اخلاق، معاشرت اور معیشت کی اصلاح بھی مقدمہ بازی کو گھٹانے میں بہت کچھ مددگار ہوگی۔ پولیس اور جیل کے کارکنوں کی تربیت اور طریق کار کی اصلاح سے بھی جرائم کی تعداد میں بہت کمی واقع ہو جائیگی۔ اس طرح ہمیں اپنے نظام عدالت کے لئے اتنے ججوں اور مجسٹریٹوں اور دفتری کارکنوں کی حاجت نہ رہیگی جتنے اب درکار ہوتے ہیں، اور اسی نسبت سے عدالتوں کے دوسرے مصارف بھی کم ہو جائیں گے۔ علاوہ بریں اسلامی نظام میں تنخواہوں کا معیار بھی وہ نہ ہوگا جو اب ہے۔

دوسرے یہ کہ ان تخفیفات کے بعد عدالتی نظام کے مصارف کا جو ہلکا بوجھ ہمارے خزانے پر باقی رہ جائیگا اس کو ہم ہر داد خواہ پر ڈالنے کے بجائے اُن لوگوں پر ڈالیں گے جو عدالتوں سے بیجا استفادہ کی کوشش کریں، یا جن کو عدالتوں کی خدمات سے غیر معمولی فائدہ پہنچتا ہو۔ مثلاً جھوٹے مقدمات دائر کرنے والوں، جھوٹی شہادتیں دینے والوں، اور عدالت کے سمنوں کی تعمیل سے گریز کرنے والوں پر جرمانے کئے جائیں۔ مجرموں پر جو جرمانے کئے جاتے ہیں وہ بھی اسی مد میں شمار ہوں۔ اور ایک خاص مالیت سے زیادہ کی ڈگری جن لوگوں کو ملے اُن پر ایک خاص شرح سے ٹیکس لگا دیا جائے۔ اس قسم کی تدابیر کے

باوجود اگر محکمۂ انصاف کے بجٹ میں کوئی خسارہ رہے تو اسے خزانۂ عامرہ سے پورا کیا جانا چاہیے، کیونکہ خلق کے درمیان انصاف کرنا ایک نظامِ حکومت کے بنیادی فرائض میں سے ہے۔

خاتمۂ کلام | یہ چند تجاویز ہیں جو میرے نزدیک اس ملک میں اسلامی قانون کے اجراء و نفاذ کو ممکن بنانے کے لئے روبعمل آنی چاہئیں۔ میں چاہتا ہوں کہ اہل علم اصحاب اور وہ لوگ جو عدالت و قانون کے معاملات کا عملی تجربہ رکھتے ہیں، ان پر غور فرمائیں اور انہیں مکمل کرنے کی کوشش کریں۔ میں سمجھتا ہوں کہ میری ان گزارشات سے وہ حضرات بھی ایک بڑی حد تک مطمئن ہو گئے ہونگے جو اسلامی قانون کے نفاذ کو اب ممکن ہی نہیں سمجھتے۔ انہیں معلوم ہو گیا ہوگا کہ یہ کام کس طرح ہو سکتا ہے اور اس کی عملی تدابیر کیا ہیں۔ لیکن جیسا کہ پہلے عرض کر چکا ہوں، دنیا میں کسی چیز کی تعمیر بھی بغیر اس کے ممکن نہیں ہے کہ اس کو جاننے والے اور اس کی خواہش اور ارادہ رکھنے والے معمار موجود ہوں اور اس کی تعمیر کے لئے ضروری وسائل و ذرائع ان کے ہاتھ میں ہوں۔ یہ دونوں چیزیں جہاں بہم پہنچ جائیں وہاں سب کچھ بن سکتا ہے خواہ مسجد ہو یا شوالہ۔

(بقیہ مضمون صفحہ ۲۷) تو کیا عجب کہ ذمہ داران حکومت کا ضمیر انہیں یہ سوچنے پر مجبور کر دے کہ ان کے طریق کار میں آخر وہ کیا غلطی ہے جس کی وجہ سے ساری قوم کو جھوٹ، خیانت اور بے ایمانی کی تربیت مل رہی ہے۔ پھر یہ بھی ایک قابلِ غور معاملہ ہے کہ پہلے تو ایک بیرونی قوم اپنے مفاد کے لئے ہم پر حکومت کر رہی تھی، اس لئے لوگوں کو نہ اس پر اعتماد تھا، نہ اس سے کوئی دلچسپی اور محبت تھی، اور نہ اس کا کوئی حق وہ اپنے اوپر مانتے تھے، مگر اب تو وہ پاکستان بن چکا ہے جس کے عشق میں ساری قوم برسوں سے دیوانی ہو رہی تھی، اور اس کا انتظام وہ لوگ سنبھالے ہوئے ہیں جو قوم کے محبوب رہنما تھے، اب کیا بات کہ اسی پاکستان کا نظم و نسق چلانے اور اسے مستحکم کرنے اور ترقی دینے کے لئے جب ٹیکس لگائے جاتے ہیں تو قوم کی بہت بڑی اکثریت ان کو ادا کرنے سے جی چراتی ہے؟ کیا اس کی وجہ محض قوم کی بے حسی اور نالائقی ہے یا اس میں کچھ ہمارے سربراہ کاروں کی اپنی کوتاہیوں کا بھی کچھ دخل ہے؟ اگر ٹیکس دینے والا یہ دیکھتا کہ پاکستان کے لئے جس ایثار و قربانی کا اس سے مطالبہ کیا جاتا ہے اسی ایثار سے حکومت کے کارفرما حضرات خود بھی کام لے رہے ہیں، اور اگر ٹیکس دینے والے کو یہ اطمینان ہوتا کہ جو کچھ اس سے لیا جا رہا ہے وہ واقعی اس کی اور ملک کی فلاح و بہبود پر خرچ ہوتا ہے نہ کہ چند لوگوں کی عیاشیوں پر، تو کیا پھر بھی وہ اپنی حکومت کے مصارف میں (بقیہ مضمون صفحہ ۷۶)

خلاصہ روداد جماعت اسلامی بابتہ ۴۸-۱۹۴۷ء

از قیم جماعت

(یہ اس رپورٹ کا خلاصہ ہے جو اس سال مارچ، اپریل اور مئی کے اجتماعات میں قیم جماعت نے پیش کی تھی)

جماعت اسلامی کی زندگی کا یہ سال شدید ناموافق حالات اور نہایت پُرخطر فضا میں گذرا۔ مئی ۱۹۴۷ء میں دارالاسلام (پٹھانکوٹ ضلع گورداسپور) میں جماعت کا سالانہ اجتماع ہی ایسے حالات میں منعقد ہوا تھا کہ فساد کی آگ امرتسر شہر سے بڑھکر گورداسپور کے ضلع میں پھیلنی شروع ہوگئی تھی، پنجاب کے بڑے حصّے میں قتل و خون ریزی اور لوٹ مار کے واقعات کھلم کھلا دن رات ہورہے تھے اور پورے ضلع گورداسپور میں دفعہ ۱۴۴ نافذ تھی۔ گذشتہ دس پندرہ سال سے مسلمانوں اور غیر مسلموں کے درمیان جو قومی کشمکش، اخلاقی قیود سے آزاد سیاسی قیادتوں کے تحت برپا تھی وہ بڑھتے بڑھتے اب تعصب اور تنگ دلی کی اس حد کو پہنچ گئی تھی کہ چھوٹے اور بڑے کی تمیز کے بغیر ہر مسلمان ہندوؤں اور سکھوں کے نزدیک اور ہر ہندو اور سکھ مسلمانوں کے نزدیک گردن زدنی ہوچکا تھا۔ قومی عداوت کے اندھے جوش میں اب یہ سوال باقی ہی نہ رہا تھا کہ کون آدمی کس قسم کا ہے اور کیا خیالات رکھتا ہے۔ پرانے پرانے دوست اور صدیوں کے ہمسائے ایک دوسرے کے خون کے پیاسے ہوچکے تھے۔ خون کی پیاس معصوم بچوں، قابل رحم بیماروں، زخمیوں اور بوڑھوں تک کو معاف کرنے کے لئے تیار نہ تھی۔ اور وہ مسلمان تک ہندوؤں اور سکھوں کی نگاہ میں قابل معافی نہ تھے جو سالہا سال سے اپنی قوم کے خلاف کانگریس کا ساتھ دے رہے تھے۔ ان حالات میں یہ سخت دشوار ہوگیا تھا کہ جماعت اسلامی غیر مسلموں سے خطاب

کرکے انھیں انسانیت، شرافت اور انصاف کی طرف دعوت دے سکتی۔ دوسری طرف یہ جماعت چونکہ خود مسلمانوں کی قومی تحریک سے بھی اسی طرح کنارہ کش تھی جس طرح کانگریسی وطن پرستی کی تحریک سے الگ رہی تھی، اس لئے قوم کے بجز ایک قلیل گروہ کے جو اسلام کے اصولوں کو فی الواقع سمجھتا اور اُن کا سچا قدردان تھا، قوم کی قوم جماعت سے ناراض اور ناخوش تھی۔ اس لئے جماعت کے لئے یہ سخت مشکلات اور شدید آزمائش کا وقت تھا۔ مگر الحمدللہ کہ جماعت قلیل التعداد اور اس سے بھی زیادہ قلیل الوسائل ہونے کے باوجود نہ غیر مسلموں کے آلات حرب سے مرعوب ہوئی اور نہ اپنوں کے طعن و تشنیع سے، بلکہ نتائج سے قطع نظر خالصۃً خدا کے بھروسے پر اُس فریضے کی انجام دہی میں آخر تک مصروف رہی جو خدا کی طرف سے ہر مسلمان پر عائد ہوتا ہے۔ فسادات کے آثار ظاہر ہوتے ہی جو پالیسی جماعت نے اپنے لئے طے کی تھی وہ یہ تھی کہ :-

۱۔ ہم بندگان خدا کو فساد سے روکینگے اور انہیں بھلائی اور انصاف کی دعوت دینگے،

۲۔ جہاں فساد برپا ہوجائیگا وہاں بلالحاظ قومیت مظلوم کو بچائیں گے اور ظالم کو ظلم سے باز رکھنے کی کوشش کرینگے،

۳۔ اگر خود ہم پر حملہ کیا گیا تو بزدلوں کی طرح جان نہیں دینگے بلکہ اپنی جان و مال اور عزت کے لئے لڑینگے،

۴۔ اور اگر کسی علاقے سے مسلمانوں کے قومی خروج یا اخراج کی نوبت آجائے تو اپنی جگہ چھوڑنے والوں میں ہم سب سے پہلے نہیں بلکہ سب سے آخری ہونگے۔

خدا کا شکر ہے کہ جماعت ہر جگہ اپنی اسی طے شدہ پالیسی پر کاربند رہی۔ پنجاب میں فسادات کے آغاز کے ساتھ ہی دارالاسلام کی مرکزی جماعت نے فساد کی روک تھام کا باقاعدہ پروگرام شروع کردیا تھا۔ اگرچہ یہ کام علاقے کے بعض ذی اثر حضرات اور خاص طور پر فسادی عناصر کو بہت ناگوار تھا، لیکن ان کے علی الرغم ہم نے دارالاسلام کے مذکورہ اجتماع سے فارغ ہوکر اس کام کو اور زیادہ منظم اور تیز کردیا۔ دارالاسلام کی بستی کی کل کائنات صرف بیس آدمیوں پر مشتمل تھی۔ ان کو چار پانچ و فود میں تقسیم

کر کے نواحی علاقے کے حلقے ان کے سپرد کر دیئے گئے۔ چند ہی روز میں انہوں نے اپنے گردو نواح کی بستیوں کو اس درجہ ہموار کر لیا کہ وہ فساد کی روک تھام اور دونوں قوموں کے تعلقات کو خوشگوار رکھنے کے کام میں ہمارے ساتھ تعاون کریں۔ ان بستیوں میں سے بجز دو تین کے سب کی سب تقریباً خالص ہندوؤں اور سکھوں کی بستیاں تھیں اور مسلمانوں کے جو چند گھر ان میں آباد تھے وہ غیر مالک لوگوں کے ہی تھے۔ ان بستیوں میں مشترکہ دفاعی کمیٹیاں اور کوریں قائم ہو گئیں اور راتوں کو مشترکہ پہرے لگائے جانے لگے۔ بلکہ یہاں تک طے ہو گیا کہ باہر سے آنے والے حملہ آور جس قوم کے لوگ ہوں گے بستی میں سے اسی قوم کے لوگ آگے ہو کر ان کا مقابلہ کریں گے تاکہ قومی عصبیت کا سوال پیدا ہی نہ ہونے پائے۔ چنانچہ بعض بستیوں میں موقع آنے پر عملاً ایسا ہی کیا بھی گیا۔

ہماری توجہ کے بڑے مراکز نواحی بستیوں میں یہ کام برابر جاری رہا لیکن ہماری توجہ کے بڑے مرکز پٹھانکوٹ اور سجان پور کے شہر تھے کیونکہ علاقہ میں فساد کا اصل انحصار وہیں کے حالات پر تھا۔ وہاں کے سرکردہ غیر مسلم اور مسلمان اصحاب کو قریب کرنے کی انتہائی کوشش کی گئی اور فضا کو ایک حد تک ہموار کر بھی لیا گیا۔ لیکن ۱۵ اگست کو تقسیم ملک کے اعلان اور اس کے بعد پٹھان کوٹ میں غیر مسلم پناہ گزینوں کی آمد نے دیکھتے ہی دیکھتے شہر کی فضا کو بالکل مکدر کر دیا۔ اس کے ساتھ سیوا سنگ اور دوسرے فسادی عناصر کے اس پروپیگنڈے نے کہ راوی کے اُس پار ضلع سیالکوٹ میں ہندوؤں اور سکھوں کو بے دریغ قتل اور عورتوں اور بچوں کو زندہ جلایا جا رہا ہے جلتی آگ پر تیل کا کام کیا۔ شہر کے غیر مسلموں نے جتھہ دار "کرپان سنگھ" کے فرضی نام سے شہر میں جگہ جگہ اشتہارات چسپاں کر دیئے جن میں پٹھانکوٹ کے مسلمانوں کو نوٹس دیا گیا تھا کہ ایک ہفتہ کے اندر اندر شہر خالی کر دو۔ حکومت کا رویہ پہلے ہی مشتبہ تھا مگر جب ان اشتہارات پر کوئی کارروائی نہ کی گئی تو کامل یقین ہو گیا کہ اس شرارت میں خود امن وانتظام کے ذمہ دار حکام بھی شریک ہیں۔

پٹھان کوٹ شہر میں فساد کی ابتدا غیر مسلموں کی طرف سے اشتعال انگیزیاں مسلسل جاری رہیں حتیٰ کہ ۲۰ اگست ۱۹۴۷ء کی رات کو شہر کے مضافات میں ایک مقام پر چند سوئے ہوئے مسلمان کسانوں پر نیزوں،

تیروں اور بندوقوں سے مسلح ہو کر غیر مسلموں نے اچانک حملہ کر دیا جس میں ایک بچہ اور دو ساٹھ سال کے بڈھے بہت بُری طرح مجروح ہوئے۔ اس حملے کا شور مچتے ہی شہر کے مسلمانوں میں سراسیمگی اور دہشت پھیل گئی اور صبح ہوتے ہی ملی جلی آبادی کے محلوں سے نکل نکل کر مسلمان اکثریت کے محلوں میں جمع ہونے لگے اور بعض سرکردہ اور دولتمند مسلمان بھاگنے کی فکر کرنے لگے۔ اس واقعہ کی اطلاع ملتے ہی امیر جماعت نے ہمارے پٹھان کوٹ والے وفد کو پٹھان کوٹ روانہ کیا تاکہ سارے واقعہ کی تحقیقات اور صحیح صورت معلوم کریں اور دونوں فریقوں کے رہنما لوگوں سے ملکر انھیں حالات پر قابو پانے کی طرف متوجہ کریں۔ یہ حضرات پٹھان کوٹ گئے، زخمیوں سے ہسپتال میں ملے، سارے حالات دریافت کئے، پولیس کے ہمراہ جائے وقوع پر بھی گئے اور یہ معلوم کر کے کہ اس واقعہ کی ساری ذمہ داری ہندوؤں پر تھی، ان کے سرکردہ اور سنجیدہ لوگوں سے ان کے گھروں پر جا کر ملے اور ان کی قوم کی زیادتی اور اس کے نتائج کی طرف ان کو توجہ دلائی۔ ہمارے رفقاء اسی روز غیر مسلموں کی بعض ٹولیوں سے بھی مخاطب ہوئے اور ان کے صالح عناصر کو اپنی ذمہ داریاں سمجھنے اور انجام دینے کی طرف متوجہ کیا۔

لیکن ہماری اس ساری کوشش کے باوجود شہر کے حالات بد سے بدتر ہوتے گئے۔ اگرچہ دونوں فریق ہماری بے غرضی، اخلاص اور نیک نیتی کے یکساں معترف تھے، لیکن پھر بھی غیر مسلموں کے نزدیک ہم بہرحال مسلمان تھے، اس لئے جو نشہ انہیں برسوں پلایا گیا تھا وہ رنگ لایا اور ۱۲ اگست ۱۹۴۷ء کو شام کے تین بجے کے قریب مسلمان محلوں پر غیر مسلموں نے پولیس اور فوج کے دیکھتے دیکھتے بے تحاشہ حملے شروع کر دئے۔ پولیس اور فوج نے نہیں ان کو روکنے کی کوشش نہ کی، البتہ جہاں انہوں نے دیکھا کہ مسلمان کچھ مقابلہ کی طاقت رکھتے ہیں وہاں انہوں نے مداخلت کر کے مسلمانوں کو بے بس کر دیا۔ پھر کرفیو لگا دیا گیا، مگر وہ کرفیو صرف مسلمانوں کے لئے تھا تاکہ انہیں گھروں میں بند کر دیا جائے۔ غیر مسلم اس سے عملاً مستثنیٰ تھے اور ان کی ٹولیاں ہر طرف پھر رہی تھیں۔ ہمارے رفقاء میں اس وقت پٹھان کوٹ سے دارالاسلام واپس ہوئے جب کرفیو لگایا جا رہا تھا۔ انھوں نے جابجا غیر مسلموں کی مسلح پارٹیوں کو سڑک پر متعین پایا جو علاقے میں دہشت پھیلانے اور باہر سے پٹھانکوٹ آنے والے مسلمانوں کو روکنے کے لئے بٹھائی گئی تھیں۔ اگلے

روز سارا شہر مسلمانوں سے خالی ہو گیا اور یہ سب پٹھان کوٹ ریلوے اسٹیشن کے باہر کھلے میدان میں بھیڑ بکری کی طرح جمع کر دئے گئے۔

دارالاسلام میں پناہ گزینوں کا اجتماع اس کے باوجود ہم نے ہمت نہ ہاری اور اپنی پوری قوت اس کوشش میں صرف کر دی کہ فساد پٹھان کوٹ سے باہر دیہات میں نہ پھیلنے پائے۔ خدا کا شکر ہے کہ ہم اس میں کامیاب رہے اور اس سارے علاقے میں جہاں ہم نے کام کیا تھا کوئی فساد نہ ہوا۔ لیکن حالات ایسے بگڑ چکے تھے اور باہم بے اعتمادی اس قدر بڑھ گئی تھی کہ ان بستیوں کے مسلمان از خود نکل نکل کر دارالاسلام اور قلعہ جمالپور (مکان چودھری نیاز علی صاحب) میں جمع ہونے لگے اور دو تین روز میں ہی ضلع گورداسپور کے شمال مشرقی علاقے میں بجز دارالاسلام کی ۱۲ گھروں پر مشتمل بستی اور قلعہ جمال پور کے، کوئی مسلمان بستی اپنی جگہ قائم نہ رہی۔ دارالاسلام میں ڈھائی ہزار اور نہر سے دوسری جانب چودھری نیاز علی خانصاحب کے مکان پر کوئی چھ ہزار کے قریب مسلمان پناہ گزین جمع ہو گئے۔ اب ہماری پوری توجہ پناہ گزینوں کی دیکھ بھال، خورد نوش اور دفاعی انتظامات پر مرکوز ہو گئی۔ پناہ گزینوں میں سے خال خال لوگ اپنے ساتھ کچھ لے کے آئے تھے اس لئے جو تھوڑا بہت غلہ باہر سے آیا تھا اور جو ہمارے سٹور میں تھا سب کو یکجا کر کے ہم نے راشن کا باقاعدہ انتظام کیا اور غلے کی بہم رسانی کے لئے یہ بندوبست کیا کہ ہمارے ایک ایک دو دو آدمی پناہ گزینوں کے ساتھ ان کے مکانوں پر جاتے اور ان کے غلے اٹھوا لاتے، کیونکہ آس پاس کی بستیوں میں ہمارا اتنا اخلاقی اثر تھا کہ ہم عام بدامنی کے باوجود نہتے ان بستیوں میں چلے جاتے تھے اور پناہ گزینوں کے غلے اور دوسرے سامان ان کے ہاں سے اٹھوا لاتے تھے۔ بعض اوقات نواحی بستیوں کے شریف غیر مسلم مقامی مسلمانوں کی حفاظت سے اپنے آپ کو قاصر پا کر راتوں کو انھیں خود ہمارے پاس پہنچا جاتے تھے۔

دفاع کے لئے دارالاسلام کی بستی کے چاروں طرف فوجی طرز کے مورچے کھود لئے گئے تھے تاکہ اگر کوئی ایسا وقت آجائے تو لائسنس کی دو بندوقوں سے پورا فائدہ اٹھایا جا سکے۔

پہرہ ہر طرف چوبیس گھنٹے رہتا اور پہرے کی چوکیاں بستی سے باہر دور تک قائم کردی گئی تھیں تاکہ خطرے کا قبل از وقت پتہ چلایا جاسکے۔

دارالاسلام پر حملے کی افواہ پورے علاقے کے مسلمانوں سے خالی ہوجانے کی وجہ سے حالات روز بروز خراب تر ہوتے جارہے تھے حکومت بالکل معطل تھی۔ بلکہ ذمہ دار مقامی حکام خود فسادیوں کے حامی و مددگار تھے۔ چاروں طرف سے خبریں آنے لگیں کہ علاقے کا فسادی عنصر شرفاء پر غالب آرہا ہے اور دارالاسلام پر حملے کی تیاری میں مصروف ہے۔ نتیجۃً ہم نسبتاً زیادہ خبردار ہوگئے۔

۲۳ اگست ۱۹۴۷ء کو غروب آفتاب سے ذرا پہلے سرنا سٹیشن کی طرف سے ایک پناہ گزین نوجوان بے تحاشا بھاگتا اور شور مچاتا ہوا آیا کہ جتھہ آگیا۔ اس کے ساتھ ہی امرتسر سے پٹھان کوٹ کی طرف جاتے ہوئے ایک ٹرک پر کچھ مسلمان گذرے اور دارالاسلام کے برابر سے گذرتے ہوئے انہوں نے شور مچایا کہ جتھہ آگیا۔ اتنے میں قلعہ جالپور کی طرف سے نعرہ ہائے تکبیر اور سرنا گاؤں کی طرف سے غیر مسلموں کے نعروں کی آوازیں آنے لگیں اور چند ہی منٹ بعد نہر کی جانب سے شور ہوا کہ ادھر سے جتھہ آرہا ہے۔ بادل گھرا ہوا تھا۔ رات قریب تھی، چاروں طرف نعروں کا شور تھا، لیکن دارالاسلام کی بستی میں کامل سکوت تھا۔ البتہ ہر شخص اپنی جگہ بالکل چوکنا اور خبردار اور زندگی کے آخری معرکے کے لئے تیار تھا۔ کیونکہ یہ بات تو بہر حال طے تھی کہ اگر ایسا وقت آگیا تو چوہوں کی طرح نہیں بلکہ سچے مسلمانوں کی طرح فسادیوں سے اپنی قیمت وصول کرکے ہی مریں گے۔ الحمد للہ کہ یہ سارا شور ایک بے بنیاد ہنگامہ ثابت ہوا۔ نہ کوئی حملہ آور آیا اور نہ ہی کوئی جتھہ نمودار ہوا۔ بعد میں یہ حقیقت کھلی کہ محض جتھوں کی آمد کی خبریں اڑا کر مسلمانوں سے بڑے بڑے علاقے خالی کرائے جاچکے ہیں، اور اب یہی حربہ یہاں بھی آزمایا گیا تھا۔

عبدالرحمٰن صاحب کا قتل اگلا روز یعنی ۲۴ اگست ۱۹۴۷ء ہماری دارالاسلام کی زندگی کا

سخت ترین دن تھا۔ ہمارے چوکیدار عبدالرحمٰن صاحب بہاولپوری حسبِ معمول کچھ پناہ گزین عورتوں کا سامان ان کے گھروں سے نکلوانے کے لئے ایک قریبی بستی میں گئے اور اُن کا سامان دارالاسلام بھیج کر خود ایک دوسری بستی کی طرف روانہ ہو گئے۔ دوپہر تک جب وہ نہ آئے تو سخت تشویش پیدا ہوئی۔ آخر ظہر سے ذرا پہلے ایک پناہ گیر نے آکر اطلاع دی کہ عبدالرحمٰن کو اُس نے دارالاسلام کی حدود سے باہر زخمی اور بے حس و حرکت پڑے دیکھا ہے۔ امیر جماعت نے فوراً ہی سات آٹھ آدمیوں کو موقعہ کی طرف روانہ کیا اور ہدایت فرمادی کہ اگر عبدالرحمٰن میں زندگی کے کوئی آثار نہ پائے جائیں تو پھر اُنھیں بستی میں لانے کے بجائے اُدھر ہی قبرستان میں دفن کر دیا جائے تاکہ پناہ گزین، جو پہلے ہی ہراساں ہیں، دہشت زدہ ہو کر کوئی ایسی حرکت نہ کر بیٹھیں کہ فسادی اور دلیر ہو جائیں۔

عبدالرحمٰن کے سینے میں نیزوں کے کئی سوراخ اور ہاتھوں اور گردن میں کرپانوں کے کئی زخم تھے، لیکن الحمدللہ کہ ان کی پشت پر کوئی زخم نہیں پایا گیا۔ مرحوم شہید تھا اس لئے اسے اسی کے کپڑوں میں خون آلود دفن کر دیا گیا۔ جس گاؤں میں عبدالرحمٰن صاحب اس روز گئے تھے یہ سکھوں کا گاؤں تھا۔

اس واقعہ سے ہمیں معلوم ہو گیا کہ ہمارے اخلاق اور حسن سلوک کا سکھوں پر یا تو کوئی اثر ہوا ہی نہیں، یا اگر ہوا تھا تو وہ اب باقی نہیں رہا۔ ساتھ ہی یہ بھی یقین ہو گیا کہ دارالاسلام پر حملے کا اگر کوئی پروگرام ہے تو اس کے لئے آج کی رات سے موزوں رات اور کوئی نہیں ہو سکتی چنانچہ ہم نے دفاع کا تفصیلی نقشہ مرتب کر کے مورچوں کو مضبوط کیا اور سرِ شام ہی عورتوں اور بچوں کو امیر جماعت کے مکان میں جمع کر کے ہر صورت حال کے مقابلے کے لئے تیار ہو گئے۔ امیر جماعت نے عورتوں کو خطاب کر کے فرمایا کہ "شاید اہل دارالاسلام کی زندگی کا یہ آخری دن ہو۔ جب تک ہم میں سے ایک مرد بھی زندہ ہے دشمن انشاءاللہ تم تک نہ پہنچ سکیگا۔ لیکن اگر مرد خدانخواستہ ختم ہو جائیں تو تمہیں مومن عورتوں کی طرح کٹ مرنا ہوگا۔ نہ خودکشی کرنا اور نہ اپنے آپ کو زندہ کسی کے حوالہ کرنا۔ جو حملہ آور ہو اس کا مقابلہ کرو اور اپنی عزت کے لئے لڑ کر جان دیدو۔" یہ پوری رات

دارالاسلام کے مردوں اور عورتوں کے لئے بالکل محاذ جنگ کی سی کیفیت میں گذری۔ پناہ گزین عورتوں، بچوں اور بوڑھوں کو بالکل باطمینان سلادیا گیا، بلکہ ان میں سے اکثر کو اندازہ ہی نہ ہو سکا کہ ہم کن حالات کا مقابلہ کرنے کے لئے تیار ہو رہے ہیں۔

یہ رات بھی خدا کے فضل سے بخیریت گذر گئی، لیکن اب حالات اس قدر خراب ہو چکے تھے کہ ہم نے فیصلہ کرلیا کہ زیادہ سے زیادہ دو روز اور انتظار کریں اور اس کے بعد قافلہ کی صورت میں چلدیں۔

لاہور سے مدد کی آمد اسی روز (۲۵ اگست ۱۹۴۷ء) شام کو عصر کے بعد ہمارے رفقاء لاہور سے ایک کنوائے کے ساتھ دو بسیں لے کر دارالاسلام پہنچ گئے۔ انہوں نے بتایا کہ ہم بہت مشکل سے دو بسیں لے کر آئے ہیں، دوبارہ مدد پہنچنے کی کوئی توقع نہیں، کنوائے صرف آدھ گھنٹہ ٹھیرے گا، اس لئے آپ لوگ عورتوں اور بچوں کو لے کر فوراً سوار ہو جائیں، سامان اور دوسری اشیاء کا خیال چھوڑ دیں، حالات حد درجہ خراب ہو رہے ہیں۔ لیکن ہم ڈھائی ہزار پناہ گزینوں کو اپنے ہاں پناہ دے چکے تھے اور یہ بھی فقط اللہ کے بھروسے اور اسی کی بخشی ہوئی قوت کے بل پر۔ اس لئے امیر جماعت نے فرمایا کہ جب تک پناہ گزینوں کی حفاظت کا تسلی بخش انتظام نہ ہو جائے یا ان کو ساتھ لے چلنے کا بندوبست نہ ہو جائے، ہم دارالاسلام سے نہیں جائیں گے، ہم نے انھیں خدا اور رسول کے نام پر پناہ دی ہے۔ ہم اپنے عہد کو انشاء اللہ ہر قیمت پر پورا کریں گے۔ آخر کار طے ہوا کہ عورتوں اور بچوں کو ان بسوں میں بھیجد یا جائے اور مرد سارے کے سارے دارالاسلام میں پناہ گزینوں کے ساتھ رہیں۔ چنانچہ اسی وقت ہم نے اپنی عورتوں اور بچوں کو، اور ان کے ساتھ جس قدر پناہ گزین عورتوں اور بچوں کو جگہ دی جا سکی انہیں سوار کر کے لاہور روانہ کر دیا۔ امیر جماعت اور جماعت کے باقی سارے مرد پناہ گزینوں کے ساتھ دارالاسلام میں ٹھہر گئے۔

دارالاسلام میں سرکاری پناہ گزین کیمپ کا قیام اور مرکز جماعت کا نقل مکان اب خطرہ دن بدن بڑھ رہا تھا۔ بارش تقریباً شب و روز ہو رہی تھی۔ عبدالرحمٰن کے قتل کے بعد باہر سے سامان خورونوش لانے کا سلسلہ بھی منقطع ہو چکا تھا۔ دن رات کی محنت اور راتوں کو

جاگنے کی وجہ سے کارکنوں کی صحتیں بھی گر رہی تھیں، اور مدد کی بجز خدا کے کہیں سے توقع نہ تھی۔ دار الحرب کی سی کیفیت پیدا ہو جانے کی وجہ سے نماز جمعہ موقوف کر دینی پڑی اور تمام نمازیں بھی صلوٰۃ خوف کی حیثیت سے ادا کی جاتیں۔ اب پھر ہم قافلے کی صورت میں چل پڑنے کا پروگرام سوچ ہی رہے تھے کہ ہماری کسی تحریک یا درخواست کے بغیر ہی دار الاسلام اور قلعہ جیالپور کو سرکاری کیمپ قرار دے دیا گیا اور ۲۹ اگست کی شام کو فوج نے آکر دونوں جگہ کا چارج لے لیا۔ اس طرح سے پناہ گزینوں کی حفاظت کی جو ذمہ داری ہم نے اٹھائی تھی اللہ تعالیٰ نے اس سے ہمیں بخیر و خوبی سبکدوش فرما دیا۔

اسی روز شام کو خدا کی مدد پہنچ گئی۔ لاہور سے ایک اور فوجی قافلہ کے ساتھ غازی صاحب تین بسیں لے کر آ گئے۔ ہم نے اپنے کپڑے، ضروری برتن، مکتبہ کی کتابوں کا بڑا حصہ، اور جماعت کا دوسرا زیادہ سے زیادہ سامان لادا۔ اپنے تین رفقاء (احسان الحق صاحب، اعظم ہاشمی صاحب اور محمد حیات صاحب) کو پناہ گزینوں کی ڈھارس بندھانے اور جماعت کے بقیہ سامان کی حفاظت کے لئے دار الاسلام میں چھوڑا، اور جتنے پناہ گزینوں کو ساتھ لیا جا سکا انھیں ساتھ لے کر ۳۰ اگست ۱۹۴۷ء بروز ہفتہ صبح آٹھ بجے کے قریب دار الاسلام سے لاہور روانہ ہو گئے۔ اس کے بعد پھر دار الاسلام سے ہمارے ذاتی یا جماعت کے سامان میں سے کوئی چیز نہیں لائی جا سکی۔ صرف ہمارے وہ رفقاء جو پیچھے چھوڑے گئے تھے، ایک قافلہ کے ساتھ بخیریت آ گئے۔ اس طرح سے ترجمان القرآن کا پورا ذخیرہ، مکتبہ جماعت کی گیارہ ہزار ایک سو اٹھارہ روپے چار آنے کی کتابیں، امیر جماعت کی لائبریری کی بہت سی نایاب کتابیں، دار الاسلام کی تقریباً پوری لائبریری، اور جماعت کا بہت سا سامان وہیں رہ گیا۔ اس سارے سامان کی قیمت کا اندازہ ستر ہزار روپے ہے۔

مشرقی پنجاب کے دوسرے حصوں میں جماعت کا کام مرکز کے علاوہ جماعت کے کارکن مشرقی پنجاب میں جہاں جہاں بھی تھے، یا جہاں جہاں وہ پہنچ سکے، انھوں نے ہر جگہ فساد کو روکنے کی انتہائی کوشش کی، اور جب فساد پھوٹ پڑا تو انہوں نے مسلمانوں کے بچانے، ان کی ہمت بندھانے اور انہیں بخیریت نکال لانے میں اپنی حد استطاعت تک پوری قوت صرف کر دی۔ گورداسپور، امرتسر، فیروزپور،

جالندھر، حصار، اور گوڑگانوہ کے اضلاع میں اور ریاست کپورتھلہ میں مختلف مقامات پر جماعت کے ارکان اور ہمدرد موجود تھے۔ ہر جگہ ان کا ایک ہی طرزِ عمل رہا۔ انہوں نے آخر وقت تک فسادی عناصر کو انسانیت اور شرافت کی راہ دکھانے کی کوشش کی اور بعض مقامات پر شریف غیر مسلموں نے بھی ان سے تعاون کیا۔ فساد کے دوران میں انہوں نے اپنے اخلاقی اثر سے اور اپنی جرأت سے نہ صرف اپنے آپ کو بچایا بلکہ ہزاروں مسلمانوں کی حفاظت کی۔ کسی جگہ بھی بھاگنے والوں میں وہ سب سے پہلے نہ تھے۔ بعض مقامات پر انہوں نے مسلمانوں کو منظم کر کے ظالموں کا پورا مقابلہ کیا۔ بعض مقامات پر وہ کیمپوں میں مسلمانوں کی خدمت کرتے رہے۔ بعض مقامات سے وہ مسلمانوں کو اپنے ساتھ لے کر نکلے۔ بعض مقامات پر وہ آخر وقت تک مسلمانوں کو بحفاظت نکالتے اور پاکستان روانہ کرنے میں لگے رہے اور خود سب کے آخر میں نکل کر آئے۔ اس کے باوجود الحمدللہ کسی کی جان اور عزت پر آنچ نہ آئی۔ صرف جموں اور دارالاسلام میں دو آدمی شہید ہوئے۔

مغربی پنجاب میں غیر مسلم مظلومین کی امداد: یہ تو جماعت کے اس کام کی مختصر رپورٹ ہے جو فسادات کے دوران میں مشرقی پنجاب میں کیا گیا۔ لیکن چونکہ اس کی تہ میں کوئی قومی تعصب کارفرما نہ تھا بلکہ ہم پہلے فیصلہ کر چکے تھے کہ ظالم کو ظلم سے روکیں گے اور مظلوم کی حفاظت کریں گے، اس لئے جس طرح ہم نے مشرقی پنجاب میں غیر مسلم ظالموں کے خلاف مسلمان مظلومین کی حمایت کی، اسی طرح مغربی پنجاب میں بھی ہم مسلمانوں کو ظلم سے روکنے اور غیر مسلموں کو بچانے کی پوری کوشش کرتے رہے، حتیٰ کہ ہمارے کارکنوں نے متعدد مقامات پر اپنی جانوں کو بھی خطرے میں ڈالنے سے گریز نہ کیا۔ لاہور، سیالکوٹ، گجرات، سرگودھا، جہلم، مردان اور پشاور کے اضلاع میں کئی مقامات پر ہمارے رفقاء اور ہمدرد حضرات نے نمایاں کام کیا۔

صوبہ سرحد کے ایک گاؤں میں جب مسلمان فسادی مقامی غیر مسلم آبادی کے قتلِ عام پر بالکل تل گئے اور انہوں نے گاؤں کا ہر طرف سے محاصرہ کر لیا اور زبانی تلقین کے لئے فسادیوں کے کان بہرے ثابت ہوئے تو ہمارے رفقاء اور ہمدردوں نے مظلومین کے تحفظ میں اپنی جانوں پر

کھیل جانے کا فیصلہ کیا اور اپنے بھائیوں اور رشتہ و برادری کے لوگوں پر واضح کر دیا کہ "آج ہم حق کی خاطر آپ کے خلاف لڑیں گے۔ ان بے گناہ غیر مسلموں کو گزند پہنچانے کے لئے آپ کو پہلے ہمارے سرتن سے الگ کرنے پڑیں گے۔" نتیجہ یہ ہوا کہ ان کے رشتہ و برادری کے سب لوگ فسادیوں سے کٹ کر ان کے ساتھ آملے، فسادی اپنے منصوبے میں ناکام ہو کر محاصرہ چھوڑ گئے اور غیر مسلموں کو بخیریت کیمپ میں پہنچا دیا گیا۔ عین فساد کے دوران میں ہمارے بعض رفقاء نے غیر مسلم لڑکیوں کو فسادیوں سے چھڑا کر کیمپوں میں ان کے اعزا، یا دوسرے غیر مسلم ذمہ دار لوگوں تک پہنچایا۔ بعض نے بے گناہ غیر مسلموں کو بچانے کے لئے اپنے سینکڑوں روپے خرچ کر دیئے۔ ان کو قوم کا غدار، قومی مفاد کا دشمن، اور جذبۂ ایمانی سے خالی قرار دیا گیا اور ہر طرف سے ان پر طعنوں کی بوچھاڑ کی گئی لیکن انہوں نے کیا وہی کچھ جو انہیں مسلمان ہونے کی حیثیت سے کرنا چاہیئے تھا۔ رائے عامہ یا مفاد عمومی کی جھونک نے بھی انہیں راہ حق سے نہ پھیر سکا [illegible] آیا۔ گاؤں کے لوگوں نے جس کے سربراہ کار لوگ ہمارے حلقۂ ہمدرداں میں شامل تھے، گردو نواح کے بارہ دیہات کے غیر مسلموں کو نہ صرف پناہ دی بلکہ انہیں بحفاظت رخصت کیا۔

(باقی مضمون صفحہ ۲۵۸) حصہ لینے سے یونہی گریز کرتا؟

سائل کو، اور اس جیسے تمام ایماندار تاجروں کو میرا مشورہ یہ ہے کہ اول تو وہ حکومت کے ٹیکس پوری طرح ادا کرنے کی کوشش کریں۔ لیکن اگر یہ بالکل ناممکن ہو جائے اور اس طرح ان کے لئے اپنا پیٹ پالنا بھی مشکل ہو تو پھر وہ صرف اس حد تک عام دکانداروں کی تقلید کر سکتے ہیں کہ اپنی بکری کا ایک حصہ رجسٹروں میں درج کریں اور ایک حصہ درج نہ کریں۔ مگر سرکاری کارندوں کے سامنے انہیں نہ جھوٹ بولنا چاہیئے اور نہ ان کو رشوت دینی چاہیئے۔ بلکہ ان سے صاف کہنا چاہیئے کہ ہمارے حسابات ادھورے ہیں اور ہم اس کے لئے تیار ہیں کہ آپ ہم پر مقدمہ چلا دیں۔ اگر مقدمہ چلایا جائے تو انہیں عدالت کے سامنے بازار کی تمام صورت حال صاف صاف کہہ دینی چاہیئے اور یہ بھی بتا دینا چاہیئے کہ ان حالات نے ایک ایماندار تاجر کے لئے حلال کی روٹی کمانا کس قدر دشوار کر دیا ہے۔ کاش کچھ صاحب ہمت لوگ ایسے ہوں جو اس طریقہ پر عمل کر گزریں۔ اس طرح قوم کے ضمیر کو یہ احساس دلانا آسان ہو جائیگا کہ موجودہ غلط نظام حکومت کی وجہ سے کس طرح ایمانداری خطا اور بے ایمانی صواب بن کر رہ گئی ہے۔

رسائل و مسائل

بکری ٹیکس

"میں بزازی کا کاروبار کرتا ہوں۔ یکم اپریل ۴۸ء سے ہم پر بکری ٹیکس لگایا گیا ہے اور ہمیں اختیار دیا گیا ہے کہ یہ ٹیکس اپنے گاہکوں سے وصول کرلیں۔ لیکن عام دوکاندار یہ ٹیکس نہ گاہکوں سے وصول کرتے ہیں اور نہ خود ادا کرتے ہیں۔ اس سے بچنے کے لئے انہوں نے طریقہ یہ اختیار کیا ہے کہ اپنی روزمرہ کی اصل فروخت کا حساب وہ اپنے باقاعدہ رجسٹروں میں درج ہی نہیں کرتے۔ حکومت کے کارندوں کو وہ اپنے فرضی رجسٹر دکھاتے ہیں، اور جب ان کے رجسٹر پر کسی شک کا اظہار کیا جاتا ہے تو رشوت سے منہ بند کردیتے ہیں۔ دوسرے دوکانداروں کے لئے تو یہ جعل اور رشوت آسان ہے، مگر ایک ایماندار تاجر کیا کرے؟ وہ خریداروں سے ٹیکس وصول کرتا ہے تو اس کا مال فروخت نہیں ہوسکتا، کیونکہ اسکے پاس ہی ایک ایسا دوکاندار بیٹھا ہے جو ٹیکس لئے بغیر اس کے ہاتھ مال فروخت کرتا ہے۔ اور اگر وہ خریدار سے ٹیکس نہیں لیتا تو اسے اپنے منافع میں سے یہ ٹیکس دینا پڑتا ہے اور اس صورت میں بسا اوقات اُسے کچھ نہیں بچتا بلکہ بعض چیزوں میں تو منافع اتنا کم ہوتا ہے کہ پورا منافع ٹیکس میں دینے کے علاوہ تاجر کو کچھ اپنی گرہ سے بھی دینا پڑ جاتا ہے۔ سوال یہ ہے کہ ہم تجارت چھوڑ دیں یا فرضی حساب رکھنے شروع کردیں؟

مزید ستم ظریفی یہ ہے کہ ہم جو صحیح حسابات رکھتے ہیں انہیں بھی سرکاری کارندے فرضی سمجھتے ہیں کیونکہ جہاں ۹۹ فی صدی تاجروں کے حسابات فرضی ہوا کرتے ہوں وہاں ایک فیصدی کے متعلق انہیں یقین نہیں آتا کہ اس کا حساب صحیح ہوگا۔ اس لئے وہ اپنے قاعدہ کے مطابق ہماری بکری کا اندازہ بھی زیادہ لگا کر ہم سے زیادہ ٹیکس کا مطالبہ کرتے ہیں۔ اب کیا ہم اس سے بچنے کے لئے انہیں رشوت دیں یا اپنی ایمانداری کی پاداش میں اس زائد ٹیکس کا جرمانہ بھی ادا کریں؟"

یہ سوال دراصل ہم سے نہیں حکومت سے کیا جانا چاہئے تھا۔ اس کی پیدا کی ہوئی مشکلات کا حل خود اسی کو تجویز کرنا چاہئیے۔ اس نوعیت کے سوالات اگر اس کے پاس بھیجے جائیں (باقی صفحہ ۲)

مطبوعات مکتبہ جماعت اسلامی

الجہاد فی الاسلام	(زیر طبع)	ہیگل مارکس اور نظام اسلام	(زیر طبع)
رسالہ دینیات	۱/۸/-	رسالہ دینیات (انگریزی) نیا ایڈیشن	۳/۸/-
حقوق الزوجین	۱/۸/-	اسلام کیا ہے (انگریزی) نیا اڈیشن	۱/۸/-
مسئلہ قومیت	۱/۸/-	الحاد کے بعد کیا (")	-/۱۲/-
مسئلہ جبر و قدر	۱/۰/-	سلامتی کا راستہ	-/۶/-
تجدید و احیائے دین	۱/۰/-	اسلام کا نظریہ سیاسی	-/۸/-
اسلامی عبادات پر تحقیقی نظر	۱/۰/-	اسلامی حکومت کس طرح قائم ہوتی ہے؟	-/۸/-
قرآن کی چار بنیادی اصطلاحیں	۱/۴/-	انسان کا معاشی مسئلہ	-/۸/-
سیاسی کشمکش حصہ اول	۱/۴/-	اسلام کا اخلاقی نقطہ نظر	-/۹/-
سیاسی کشمکش حصہ دوم	۲/۸/-	نیا نظام تعلیم	-/۶/-
سیاسی کشمکش حصہ سوم	۲/۰/-	ہندوستان میں تحریک اسلامی کا آئندہ لائحہ عمل	-/۸/-
اسلام کا نظام حیات	-/۱۰/-	دین حق	-/۶/-
پردہ	۲/۸/-	اسلام اور جاہلیت	-/۶/-
تنقیحات	۲/۸/-	ایک اہم استفتا	-/۳/-
خطبات نیا ایڈیشن	(زیر طبع)	دستور جماعت اسلامی	-/۳/-
تفہیمات	۳/۸/-	روداد جماعت اسلامی حصہ اول	۱/۰/-
حقیقت توحید	۱/۲/-	روداد جماعت اسلامی حصہ دوم	-/۱۳/-
اسلام اور ضبط ولادت	۱/۰/-	روداد جماعت اسلامی حصہ سوم	(زیر طبع)
مسئلہ سود (زیر طبع)	۳/۸/-	رود اجتماع خواتین	(زیر طبع)

ملنے کا پتہ

مکتبہ جماعتِ اسلامی

ذیلدار پارک اچھرہ - لاہور (پاکستان)